فہرستوں کا فادہ بہت محدود ہے، تیسرا باب زیادہ اہم ہے، اس میں قدیم عربی و ایرانی اور جدید مغربی ناموں کے فہرستوں میں اندراج کی صورتوں کا ذکر ہے، مصنف نے ناموں کے مختلف اجزا خطاب، کنیت، اصل نام نسب، لقب، نسبت اور تخلص پر علیحدہ علیحدہ بحث کر کے فہرستوں میں ان کے اندراج کے اصول بتائے ہیں اور مثالوں سے واضح کیا ہے کہ ناموں کی ان مختلف صورتوں میں سے کس کو کہاں پہلے درج کیا جانا چاہئے، چوتھے باب میں کتابوں کے اندراج کی بحث کے ضمن میں ان کی مختلف نوعیتوں کا ذکر ہے، اور پھر ہر نوعیت کے اعتبار سے اندراج کے قاعدے تجویز کئے گئے ہیں، اس میں کتابوں اور مصنفین کے متعلق مواد و معلومات کے مراجع کے علاوہ اس کا بھی ذکر ہے، کہ فہرستوں میں کس قسم کے وضاحتی بیان شامل کئے جائیں مصنف نے جو اصول و سفارشات تجویز کئے ہیں، ان سے چاہے کسی کو مکمل اتفاق نہ ہو تاہم انھوں نے غور و فکر سے یہ قاعدے اور اصول متعین کئے ہیں، مشرقی کتب خانوں کی ترتیب و تنظیم، اور فہرست سازی میں اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔

لالہ و گل - از مولوی عبد المعبود صاحب نادان بستوی تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۳۲ قیمت ۸۰ پیسے ناشر علمی کتاب گھر، شاہ گنج جونپور۔

مولوی عبد المعبود صاحب نادان بستوی، شعر و سخن کا ذوق رکھتے ہیں، انھوں نے اپنے دوستوں کی شادی کے موقع پر جو سہرے کہے تھے، ان کو اس مختصر مجموعہ میں یکجا کر دیا ہے، اس کے ساتھ حمد و نعت بھی ہے، اور چند اشعار حکمیہ سے متعلق بھی ہیں،

جلد ۱۱۷ ماہ مئی سنہ ۱۹۷۶ء مطابق ماہ جمادی الاول سنہ ۱۳۹۶ھ عدد ۵

مضامین

شذرات

ہندوستان کی آزادی کو ابھی تیس برس بھی نہیں ہوئے، مگر گنتی کے انہیں چند برسوں میں ملک کے زمین و آسمان بدل گئے، اصول سیاست ہوں یا آدابِ حکومت، طرزِ جہانبانی ہو یا اندازِ حکمرانی، دستورِ حکومت ہو یا آئینِ عدالت، نظامِ معیشت ہو یا طریقۂ معاشرت، ضابطۂ تعلیم و تربیت ہو یا معیارِ اخلاق و ثقافت، زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو تغیر و انقلاب سے دوچار نہ ہو، ماضی کی شاندار روایتیں طاقِ نسیاں کی نقش و نگار بن چکی ہیں، خوب و ناخوب کے پرانے معیار بدل گئے ہیں، حسن و قبح کے قدیم تصورات قصۂ پارینہ ہوگئے ہیں، اور زندگی کے ہر میدان میں فکر و عمل کی نئی طرحیں پڑ رہی ہیں، اور ہر جگہ پرانی بساط الٹ کر نئی بچھائی جا رہی ہے،

یہ صورتِ حال کسی کو پسند ہو یا ناپسند، لیکن اس کی واقعیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، انقلاب آرہا ہے، اور ایسی تیز رفتاری کے ساتھ کہ جو سامنے آتا ہے چور چور ہو جاتا ہے، گذشتہ پچاس برس میں اس سیلاب کو روکنے کی جان توڑ کوششیں کی گئیں، اور بڑی صاحبِ قوت و شوکت طاقتیں سامنے آئیں، مگر کسی کے قدم جم نہ سکے، مجبوراً پناہ گاہوں کی تلاش ہوئی، مگر جب یہ سعی بھی لاحاصل ثابت ہوئی تو حیرانی و سراسیمگی کے عالم میں کھڑے بے مہریٔ ایام کا گلہ اور فلک کج رفتار کی شکایات کر رہے ہیں، لیکن نہ ماضی سے عبرت حاصل کرتے ہیں، نہ حال سے سبق لیتے ہیں، بلکہ

حکایات و شکایات کے دفتر میں غرق فکرِ فردا سے غافل ہیں،

یہ حالات صرف ہمارے ہی ملک میں نہیں پیش آرہے ہیں، بلکہ آج ساری دنیا انقلاب سے دوچار ہے، سبھی ملکوں کا پرانا نظام ختم ہو رہا ہے، اور نیا نظام اس کی جگہ لے رہا ہے، کہیں رفتار تیز ہے کہیں سست، لیکن رخ سب کا ایک ہی طرف ہے، دنیا پرانے سانچے توڑتی جا رہی ہے اور ان کے بجائے نئے ڈھال رہی ہے، انقلاب کو روکنے کی جد و جہد ہمیشہ کی گئی ہے، لیکن اس کوشش کا انجام بھی سب کو معلوم ہے، اس سیلاب کے دھارے میں مخالفت کے پشتے ریت کی دیوار کی طرح بہ گئے، اور مخالفین اس طرح نیست و نابود ہوگئے کہ کوئی ان کا نام لیوا بھی باقی نہیں رہا، کیسے کیسے کوہ گراں اس طوفان بلاخیز کی موجوں سے ٹکرا کر چور چور ہو چکے ہیں،

یہ کشمکش ہر دور میں پیش آئی، اور ہمیشہ ناکامی و نامرادی کے سوا اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا، تاریخ کے اوراق کھلے ہیں جس کا جی چاہے ماضی کے اس آئینے میں مستقبل کی تصویر دیکھ لے، اس طویل تجربہ کے بعد کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ مخالفت کے بجائے مفاہمت اور نبرد آزمائی کی جگہ صلح جوئی کی روش اختیار کی جائے، ماضی کی یاد خواہ تلخ ہو یا خوشگوار، بہرحال قصۂ ماضی بن چکی ہے، اس لئے ان بھولی یادوں کی یاد میں حال سے غفلت اور مستقبل سے بے پرواہی کسی طرح مناسب نہیں ہے، ہمیں گذشتہ واقعات کو تاریخ کے حوالہ کر کے آئندہ کی فکر کرنی چاہئے، اور ایک عرب شاعر کی طرح کہنا چاہئے کہ

ولستُ بلوّامٍ علی الامر بعدما   یفوتُ ولکن علّ ان اتقدّما[۱]

۱؎ میں معاملہ کے فوت ہو جانے کے بعد اس پر ملامت نہیں کرتا، بلکہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہوں

۱۹۲۶ء کی بات ہے کہ مکہ معظمہ میں موتمر عالم اسلامی کے جلسے ہو رہے تھے، اس میں مسلم ممالک کے نمائندوں کے علاوہ ہندوستانی مسلمانوں کو بھی نمایندگی دی گئی تھی، مولانا محمد علی نے اپنی پرزور تقریروں سے سارے اجلاس میں لچل مچادی، اس زمانہ میں سلطان ابن سعود سے ان کا اختلاف شروع ہو چکا تھا، لیکن اس وقت اُن کی مخالفت کا رُخ ابنِ سعود سے زیادہ حکومت برطانیہ کی طرف تھا جس کو وہ اصل میں بنیاد سمجھتے تھے، مندوبین مولانا کی ولولہ انگیز تقریروں سے بہت متاثر ہو رہے تھے اور قریب تھا کہ کوئی سخت تجویز منظور ہو جائے کہ اتنے میں ترکی کے رئیس وفد ادیب ثروت بے آگئے، انھوں نے مولانا کو مخاطب کرکے کہا کہ محمد علی تمھارے خلوص میں کلام نہیں میں تمھارے جذبات کی قدر کرتا ہوں مگر ہم لوگوں کو جوش کے ساتھ ہوش سے بھی کام لینا پڑتا ہے، گو آج ہمارا شاندار ماضی رخصت ہو چکا ہے لیکن اس گئی گذری حالت میں بھی کچھ رکھتے ہیں، اس لئے سوچ سوچ کر بولتے ہیں اور پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں تاکہ جو کچھ رہ گیا ہے اسے بچایا جائے، اشیر اگر سو رہا ہے تو ایک ناتجربہ کار اور غیر مسلح شخص کو دبے پاؤں چپکے سے گذر جانا چاہئے، ایسی حالت میں اُسے للکارنا، اور بانس سے کونچ کونچ کر بیدار کرنا بہادری نہیں بلکہ نادانی ہے، ثروت بے کی اس تقریر سے مسلم ممالک کے نمایندے بہت متاثر ہوئے، اور تجویز منظور نہ ہو سکی۔[1]

خدا کا شکر ہے کہ مسلمانوں کو اپنی معاشی حالت درست کرنے کی فکر پیدا ہو گئی ہے اور گذشتہ برسوں میں اُن کے اندر کاروبار کی طرف سے جو بے توجہی پیدا ہو گئی تھی وہ آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے، کچھ عرصہ ہوا سفر میں ایک سندھی تاجر سے ملاقات ہوئی، اُس نے کہا کہ کاروبار کی جانب سے مسلمانوں میں جو افسردگی پیدا ہو گئی تھی، وہ اب دور ہو گئی ہے اور بڑی تیزی سے وہ تجارت میں حصہ لے رہے ہیں، اور بازار پر ان کا اثر بڑھتا جا رہا ہے، سندھی تاجر کی اس گفتگو سے بڑی خوشی ہوئی، خدا کرے یہ توجہ قائم رہے،

---

[1] خلافت کمیٹی کے سابق سکریٹری مولانا محمد عرفان مرحوم نے یہ واقعہ مجھ سے بیان کیا تھا وہ مولانا محمد علی کے بہت مقرب تھے، اور اس موقع پر موجود تھے،

مقالات

سعید نفیسی کے چند تسامحات

از

ڈاکٹر (مسز) اُمّ ہانی فخر الزمان، ریڈر شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،

استاد سعید نفیسی مرحوم کی علمی قابلیت اور بلند پایہ شخصیت، فارسی ادب کی دنیا میں تفصیل و تعارف کی محتاج نہیں، اس لئے کہ موصوف ایران اور ہندوستان (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے علاوہ دنیا کے سترہ ملکوں میں پروفیسری کے عہدہ پر فائز رہ چکے ہیں، اور دو سو بیس (۲۲۰) کتابیں اُن کے قلم کی رہینِ منت ہیں، ان کی دو سو اکیسویں کتاب "تاریخ نظم و نثر در ایران و در فارسی تا پایان قرن دہم ہجری" کو انتہائی فخر کے ساتھ کہئے "از آثار جاویدان استاد" تسلیم کرتے ہوئے کتابفروشی فروغی نے دو (۲) ضخیم جلدوں میں شائع کیا ہے (۱۳۴۴ھ ہجری شمسی) اس مختصر مقالے میں پوری کتاب کا احاطہ تو ممکن نہیں لیکن شعرائے قرن دہم کو پڑھنے کے بعد خاکسار نے یہ ضروری سمجھا کہ چند نکات خصوصاً تواریخ، آثار، اور اسماء وغیرہ پر اپنی رائے کا اظہار کر دیا جائے، ایک شہرۂ آفاق مصنف کا یہ طرزِ تحقیق دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ موصوف نے تاریخ نویسی کے مسلمہ اصولوں سے قطعاً صرف نظر کرتے ہوئے وہ طریقہ اختیار کیا جو کسی مبتدی کے لئے بھی مناسب نہ تھا، کتاب میں بیک نظر جس چیز کی شدت سے کمی محسوس ہوتی ہے، وہ یہ کہ مصنف نے کہیں بھی برمحل

ماخذ کی نشاندہی نہیں کی، آخر میں تقریباً ستر صفحات پر مشتمل آخذ کی ایک فہرست دی ہے لیکن یہ پتا نہیں چلتا کہ کس ماخذ سے کہاں کام لیا ہے، اگر وہ ماخذ کا حوالہ نہیں دیتے، تو سیکڑوں برس کے بعد خود نفیسی صاحب کے بیان پر کوئی صاحبِ عقل یقین نہیں کرسکتا، کسی مصنف یا شاعر کے حالات کی تحقیق کرتے وقت ضروری ہوتا ہے کہ سب سے پہلے خود اس کے آثار سے رجوع کیا جائے، اس کے بعد ہم عصر اور قریب العصر ماخذ سے مواد حاصل کرکے خود اپنے زمانے تک کی تمام اطلاعات پر تنقید کرتے ہوئے اپنا فیصلہ ہدیۂ ناظرین کیا جائے، اور اُن کو ردّ و قبول کا موقع دیا جائے،

بظاہر نفیسی صاحب نے گیارہ سو بہتر صفحات پر مشتمل یہ ضخیم کتاب لکھ ڈالی، مگر پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ضخامت کی وجہ صرف تکرار ہے، ایک ہی شاعر کا حال مختلف جگہ لکھ دیا گیا ہے اور ایک ہی واقعے کے متعلق مختلف بیانات دیدیئے گئے ہیں، اس میں تکملہ کے نام سے بھی (ص ۱۳-۷۲ ۸) ایک حصہ دوسری جلد میں دیا ہے جس میں انھوں نے صفحاتِ ماسبق کی اطلاعات میں اصلاح یا اضافہ کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن یہ دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی کہ بیشتر تراجم میں ان دونوں مقاصد میں سے کوئی مقصد پورا نہ ہوسکا، بلکہ یہ بھی ہوا کہ صحیح لکھ کر بعد میں اس کی تردید کردی، ایک ہی واقعے کے بارے میں اتنے مختلف بیانات ہیں کہ پڑھنے والا کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود نفیسی صاحب کے سامنے بھی حقیقتِ حال واضح نہیں تھی، اس دور کے شعراء سے متعلق ہمارے ہندوستان میں نفائس المآثر اور منتخب التواریخ کے ایسے معتبر ماخذ موجود ہیں، اور ایسے علماء و فضلاء بھی ہیں جنھوں نے نفیسی صاحب کی اس کتاب سے پہلے اس موضوع سے متعلق متعدد مقالات اور کتابیں لکھ ڈالی ہیں، علی گڈھ میں قیام کے زمانہ میں نفیسی صاحب ڈاکٹر ہادی حسن صاحب مرحوم اور ڈاکٹر نذیر احمد صاحب سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے، ان دونوں اصحاب کی تحقیقات نفیسی صاحب کی زیرِ بحث تصنیف سے پہلے پرانی ہوچکی تھیں،

اگر نفیسی صاحب صرف ان ہی سے استفادہ کرتے تو اُن کی کتاب کا یہ معیار نہ ہوتا، جو اس وقت ہے،

دوسری افسوسناک چیز یہ ہے کہ نفیسی صاحب نے کسی شاعر کے اشعار یا نثر کا نمونہ نہیں دیا، اور دیباچہ میں جگہ کی کمی کا عذر کردیا، میرا خیال ہے کہ اگر تکرار سے گریز کرتے ہوئے مناسب توازن کے ساتھ نمونۂ کلام (یا نثر) بھی دیدیتے، تو ضخامت میں زیادہ فرق نہیں آتا،

چونکہ نفیسی صاحب نے خود دیباچہ میں کتاب کے پڑھنے والے کو تنقید کی طرف متوجہ کیا ہے، اس لئے خاکسار کو یہ چند نکات پیش کرنے کی جسارت ہوئی، نیز یہ خیال بھی ظاہر کرنا ضروری ہے کہ چونکہ یہ موضوع اہم ہے، اس لئے پوری کتاب پر نظرِ ثانی کرکے دوبارہ شائع ہونا چاہئے، بشرطیکہ تحقیق کے اصولوں کی پابندی کی جائے،

چونکہ زیرِ بحث کتاب کا نام بہت طویل ہے، اس لئے آئندہ صفحات میں اس کا حوالہ صرف "نفیسی" کے نام سے دیا گیا ہے،

۱- آصفی (نفیسی ج ۱ ص ۳۰۹) در ہرات در ۲ شعبان ۹۲۱ درگذشت"

نفائس المآثر برگ ۱۲ (الف) علی گڑھ) وفاتش در شانزدہم شعبان سنۂ ثلاث و عشرین و تسعمائۃ امیر سلطان ابراہیم مورخ در تاریخ او گفتہ :-

چون آصفی آن چشم خرد را مردم	در ابر اجل گشت نہان چون انجم
پرسید دل از من کہ چہ آمد تاریخ	گفتم: "ہرات آمدہ روز دوم" (=۹۲۳)

و بر لوح مزار خواجہ آصفی کہ در گازرگاہ ہری منقوش است خواجہ خود کو یک روز قبل از وفات خود این رباعی در فوت خود گفتہ

سالے کہ رخ آصفی ہفتاد نہاد	ہفتاد تمام کرد و از پا افتاد (=۹۲۳)
زین مرحلہ رفت و گشت تاریخ وفات	بیمود رہ بقا بگام ہفتاد

اس تاریخ سے آصفی کی عمر اور وفات دونوں کا پتہ چلتا ہے،

بعد کے تذکرہ نویسوں نے اس میں غلطیاں کی ہیں مثلاً

۶ فات عاشقین:- "وفاتش در زمان سلطان حسین بالقراست سنہ ۹۲۶ مشہور است"

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کہیں سے اڑتی پڑتی خبر سنی تھی، اور یہ بھی ممکن ہے کہ آصفی کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ بطور غلط یعنی

"بیہودہ رہ بقا بگام ہفتاد" (=۹۲۸)

ان تک پہنچا ہو اور ایک ہائے ہوز کے بڑھ جانے سے پانچ کا اعداد میں اضافہ ہوگیا،

۲- خان احمد گیلانی (نفیسی ج ۱ ص ۳۰۷) "بار دیگر میانہ وے و پادشاہان صفوی بہم خورد و بر شاہ عباس قیام کرد و چون نتوانست مقاومت کند از ایران گریخت و بدربار عثمانی پناہ برد و چون سلاطین عثمانی باو یاری نکردند کہ دوبارہ بتاج و تخت خود برسد بعراق عرب آمد، در نجف ساکن شد و در ۱۰۰۵ ببغداد آمد، کہ بایران دیگر شود و سرانجام در آنجا درگذشت و تاریخ رحلت او درست معلوم نیست و بنظیر احتمال میرود کہ در ۱۰۲۰ گذشتہ باشد"

تاریخ عالم آرای عباسی (ج ۱ ص ۵۲۹) و مجمع الخواص (ص ۱۱۲) و خلاصۃ الاشعار

"در سال ۹۹۹ و بقولی ... شاہ عباس بر او خشم گرفت و گیلان تاخت و او چون یارای پایداری نداشت بخاک عثمانی گریخت و ہم آنجا در سال ۱۰۰۵ بمرگ طبیعی درگذشت"

۳- خلیفہ اسد اللہ اصفہانی (نفیسی ج ۱ ص ۸۴۴) "در ۹۶۸ ... درگذشت"

نفائس المآثر (برگ ۲۳ ب علی گڑھ) "وفاتش در شہور سنہ تسع و ستین و تسعمایۃ"

۴- قاسم ارسلان (نفیسی ج ۱ ص ۷) "... تا ۹۸۰ زندہ بودہ است"

(نفیسی ج ۲ ص ۸۳۶) "... تا (۹۷۴) زندہ بودہ است"

منتخب التواریخ عبد القادر بدایونی (ج ۳ ص ۱۷۰-۱۸۰) "ملا ساعی کہ بادشاہ ازانگہ آمدہ رحلِ اقامت در لاہور انداختند در سنہ نہصد و نود و پنج درگذشت"

۵- امیدی طہرانی کا سالِ وفات مورخوں اور تذکرہ نویسوں کے درمیان آج تک معرضِ بحث بنا ہوا ہے، ۹۲۵ سے ۹۳۰ھ تک اختلاف ہے نفیسی صاحب نے ۹۲۵ یا ۹۲۹ درج کیا ہے ملاحظہ ہو (نفیسی ج ۱ ص ۳۱۵)

"باغی ساخت و آنرا باغ امید نامید و بر سر ہمین باغ در میان وے و شاہ قوام الدین نوربخش پیشوائے نوربخشیان نزاع درگرفت و در ۹۲۹ شاہ قوام الدین بایندر اولاد را جمعی شبانہ بر سر او فرستاد و چند زخم باو زدند، و او از آن زخمہا درگذشت" (نفیسی ج ۱ ص ۷)

"شاہ قوام الدین بن شاہ شمس الدین بن شاہ قاسم نوربخشی مریدان خود را تحریک کرد و او را در ۹۲۵ یا ۹۲۹ کشتند،"

احسن التواریخ نے ۹۲۹ کے متوفیات میں اس کے قتل کو شمار کیا ہے، (ص ۱۷۷)

حبیب السیر (ج ۴ ص ۶۱۲) "مولانا امیدی در ذی الحجہ سبع و عشرین و تسعمایۃ (۹۲۷) در ملازمت نواب نامدار امیر حضرۃ البہیہ درعیش خان بدار الملک خراسان آمدہ چندگاہ ساحت آن ولایت را بیمن مقدم شریف مشرف داشت و الحق در آن اوقات با صحاب علم و کمال باحسن وجہ سلوک نمودہ، ہموارہ ہمت بر سر انجام مہام می گماشت، و در شہور سنہ تسع و عشرین و تسعمایۃ (۹۲۹) بمبالغہ و الحاح تمام رخصت مراجعت بصوب مملکت وے کہ وطن و مسکن معہودش بود حاصل نمود و بعد از طے منازل و قطع مراحل بمقصد رسیدہ، روزے چند از رنج راہ برآسود، در آن اثنا جمعی از اہل شر و فساد کہ از آنجا"

کینۂ دیرینہ در سینہ داشتند قاصد انہدام بنائے حیاتش گشتند"

تحفۂ سامی (ص ۳۳) "ثلاثین و تسعمایۃ" سال وفات)

ہفت اقلیم: "...... تاشبے آن دوحۂ ریاض فضل را از پا درآوردند، چوں شاہ اسمٰعیل

درہماں روز رخت بعالم جاوداں کشیدہ بود، بازخواست آن در تعویق افتاد"

مندرجۂ بالا تمام بیانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹۲۵ھ والی روایت کی کوئی اصلیت نہیں

اور چونکہ ہفت اقلیم کے بیان کے مطابق وہ شاہ اسماعیل کی وفات کے روز قتل ہوا ۹۳۰ھ

والی روایت کو تقویت ہوتی ہے، کیونکہ تاریخ عالم آرائے عباسی (ج ا ص ۴۴) کے مطابق

شاہ اسمٰعیل کی وفات شب دوشنبہ ۱۹ رجب ۹۳۰ھ کو ہوئی، مادۂ تاریخ "ظل" اور "خسرو دین"

(= ۹۳۰) ہے، یہاں تک تو بات صاف ہوگئی لیکن دوسرے ہمعصر اور قریب العصر ماخذوں

سے غلط فہمی ہوگئی ہے: چنانچہ

نفائس المآثر (برگ ۱۳ (الف) علی گڑھ) "خواجہ نفضل طرانی در تاریخ فوت او گفتہ:

نادر العصر امیدی مظلوم — کو بناحق شہید شد ناگاہ

شب بخواب من آمد و فرمود — کاے ز حال درون من آگاہ

بہر تاریخ قتل من بنویس — "آہ! از خون ناحق من آہ" (= ۹۲۵)

نفضل یا (بقول بعض) افضل طرانی بھی قابل اعتماد ہے، کیونکہ بقول

عرفات عاشقین: "از اول جوانی تا آخر عمر در خدمت مولانا امیدی بسر می کرد و او را

دیوان غزل است"

تحفۂ سامی: "بقدر طالب علمی دارد و شعرش بغایت رنگین و متین است"

چنانچہ بعض مورخوں اور تذکرہ نویسوں کو الجھن پیدا ہوگئی کہ ان تمام ماخذوں میں کس کو

صحیح مانا جائے، عرفات عاشقین نے نفضل طرانی کا مادۂ تاریخ جوں کا توں نقل کر دیا،

"تاریخ مفصل ایران (۶۲۴) "سال رحلت ۹۲۵ - ۹۳۰" لکھ دیا،

احمد گلچین معانی نے "میخانہ" (ص ۱۴۵) کے حواشی میں مورخوں اور تذکرہ نویسوں کے

اقوال نقل کرکے کے بعد ہفت اقلیم کے صدق قول پر شک ظاہر کیا ہے:

"شاید بجائے درہماں روز" "ہماں زودی" بودہ و تحریف شدہ باشد زیرا کہ شاہ

اسماعیل شب دوشنبہ ۱۹ رجب ۹۳۰ھ وفات یافتہ و چنانچہ امیدی در پایان سال

۹۲۹ کشتہ باشد" پھر خود ہی کہتے ہیں" باز ہم با مرگ شاہ اسمٰعیل ہفت ماہ فاصلہ دارد"

آخر میں لکھتے ہیں: "تواریخی کہ ذکر شد ۹۲۹ بود - شاہد صادق ہم ۹۲۹ ثبت کردہ،

ولے این مادۂ تاریخ کہ شہرتے دارد تاریخ قتل امیدی را شامل نیست واگر الف ممدود

را چہار م بحساب بیاوریم ۹۲۷ میشود و باز دو سال کم دارد" (ص ۱۴۸)

حالانکہ الف ممدودہ کی قیمت ایک ہی شمار ہوتی ہے، جیسا کہ عبدالنبی فخر الزمانی اور پروفیسر

نفیع نے میرزا اشرف جہاں کی تاریخ وفات جو مولانا حجازی نے لکھی تھی،

"آہ! آہ! اشرف از جہاں شدہ" (= ۹۶۸)

دونوں الف ممدودہ کی قیمت ایک ہی ایک شمار کی ہے، اور گلچیں نے میخانہ (ص ۱۵۳)

میں اسکو صحیح مانا ہے، تاریخ خوانی کے قواعد میں یکسانیت بہت ضروری ہے، کیونکہ قواعد

میں اختلاف ہو تو فن تاریخ گوئی کا مقصد فوت ہو جاتا ہے، پتا ہی نہیں چلے گا کہ تاریخ گو

نے کن قواعد کو ملحوظ خاطر رکھ کر یہ الفاظ انتخاب کئے تھے،

اب ان تمام نکات یعنی ہمعصر اور قریب العصر مورخوں اور تذکرہ نویسوں کے بیانات

نوع واقعہ میں گرد و پیش کے حالات اور تاریخ گو شاعر کے اعتبار کو ملحوظ خاطر رکھ کر اگر

مادہ تاریخ کو پڑھا جائے، تو یہ عین ممکن ہے کہ یہ تمام الجھنیں محض سہو کاتب کی ایک جنبش قلم کا کرشمہ ہوں یعنی

بہر تاریخ قتل من بنویس   "آہ وز خون ناحق من آہ" ! (= ۹۳۰)

یعنی مادۂ تاریخ میں "از" کے بجائے "وز" پڑھا جائے (ایک تو قتل کا مقدمہ دوسرا خون ناحق کا) تو مادے میں ۵ عدد کا اضافہ ہو جائے گا،

۶۔ مولانا ابو الحسن بن احمد ابیوردی کا سنہ وفات دو جگہ درج کیا ہے،

(نفیسی جلد ۱ ص ۲۹۲) "سرانجام در روز یکشنبہ ۲۳ رمضان ۹۶۹ در گذشت و اورا در اندر بیل بخاک سپردند"

(نفیسی ج ۱ ص ۴۴۲) "سرانجام روز یکشنبہ ۲۳ رمضان ۹۶۶ در گذشت جنازۂ اورا باردبیل بردند"

نفائس المآثر (برگ ۱۰۸ (الف) علی گڑھ) کے اعتبار سے دونوں غلط ہیں،

"وفاتش در شہر شوال سنہ خمس وستین وتسعمائۃ در اردبیل بود، مدت عمرش سی و سہ سال"

۷۔ بیقیدی (نفیسی ج ۱ ص ۵۶۲) کا تھوڑا سا ترجمہ حال دیا ہے، مگر اس کے مربی اور وفات کے متعلق کچھ نہیں لکھا،

نفائس المآثر (برگ ۲۷ (ب) علی گڑھ) "بحضرت میرزا ابراہیم بدخشی آشنائی داشتہ در سال نہصد و پنجاہ از جہان رفتہ"

۸۔ بیانی خواجہ عبداللہ مروارید (نفیسی ج ۱ ص ۲۶۰) ۹۲۲ لکھا ہے جسکو نفائس المآثر کی تائید حاصل ہے، مگر اس کے ساتھ نفائس المآثر (برگ ۲۸ (ب) علی گڑھ) حافظ علی کاتب کا ایک شعر نقل کیا ہے، جس کے پہلے مصرع سے بیانی کا سال ولادت اور دوسرے سے سال وفات نکلتا ہے، جس کا شاید نفیسی صاحب کو علم نہ تھا،

بجود وافزود دین قوی و دانش وجاہ (= ۸۵۸)

پناہ اہل جہان بود خواجہ عبداللہ (= ۹۲۲)

اور بقول خود (نفیسی ج ۱ ص ۳۲۶) "حافظ علی خود و پدرش از شاعران نامی دربار سلطان حسین بایقرا بودہ اند، وے چند سال صدارت واستادی ابوتراب میرزا شاہزادۂ تیموری را داشتہ است، و خوش نویس بودہ و در شعر دست داشتہ است" اور اس کے بعد نفیسی صاحب لکھتے ہیں، (نفیسی ج ۲ ص ۷۷۷) "تاریخ در گذشت وے را در ۹۴۲ و ۹۴۳ و ۹۴۸ نیز نوشتہ اند و این درست نیست" معلوم نہیں موصوف نے یہ سنین کہاں سے نقل کئے اور کیوں ان کو مسترد کر دیا،

۹۔ بیرام خاں بہارلو (ج ۱ ص ۵۵۴) "از معروف ترین رجال قرن دہم ہندوستان در دربار ہمایوں وجلال الدین اکبر بودہ" آگے کہتے ہیں "بخنجر اورا در سال ۹۶۷ کشت" ممکن ہے اس میں سہو کاتب ہو، لیکن غلط فہمی رفع کرنا ضروری ہے، نفائس المآثر (برگ ۳۱ (ب) علی گڑھ)

"این صورت در شہور ثمان وستین وتسعمائۃ واقع شد، چنانچہ از این رباعی تاریخ معلوم گردد"

بیرام بطواف کعبہ چوں بست احرام   در راہ شد از شہادتش کار تمام

در واقعہ ہاتفے پے تاریخش   گفتا کہ "شہید شد محمد بیرام" (= ۹۶۸)

"این را مولانا قاسم ارسلان گوید کہ پیش از شہادت خان مذکور مدتی در خواب یافتہ گفتہ بودم نعشش اورا بحضرت دہلی نقل نمودند، و چوں وصیت فرمودہ بود کہ استخوان اورا بمشہد رضوی علی مشرفہ التحیۃ والثنا نقل نمایند، درین مدت در گنبدے کہ شیخ گدائی در جنب مسجد خود بنا کردہ نہادہ دفن نمودند، در شہور ۹۸۵ نقل بمشہد نمودند"

منتخب التواریخ نے بھی (ج ۲ ص ۴۴) بیرم خان کی شہادت میں یہی تاریخ اور قطعۂ تاریخ نقل کیا ہے،

۱۰- تردی بیگ خاں، رودہ (نفیسی ج ۱ ص ۵۴۳) "تا ۹۸۲ کہ وے قلعہ بہروج را گرفتہ زندہ بودہ است و دیگر از و خبرے نیست" پھر لکھتے ہیں :-

(نفیسی ج ۲ ص ۸۳۳ و ۸۳۴)

"در گذشت وے را در ۹۷۷ ہم ضبط کردہ اند"

مگر واقعات کی رو سے دونوں میں سے ایک بھی صحیح نہیں، اس لئے کہ گجرات کا قلعہ بہروج ۹۷۶ میں فتح ہوا تھا، (منتخب التواریخ ج ۲ ص ۱۱۷)

تردی بیگ نے اس کی تاریخ کہی تھی :-

اولاد تمر کہ در شجاعت فرد ند — شد فتح بہر کجا کہ رو آوردند
کردند چو فتح بہروج از دی ستیز — تاریخ شد این کہ "فتح بہروج کردند"

(= ۹۷۶)

مختلف ماخذوں بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ایک ہی ماخذ میں مختلف مواقع پر بہروج کا املا مختلف ہو جانے سے مادۂ تاریخ میں اختلاف ہو گیا ہے، چنانچہ نفائس المآثر کے نسخ علی گڑھ رام پور اور میونخ میں "بروج" لکھا ہے جس سے مادۂ تاریخ میں اضافہ ہو کر ۹۷۷ ہو جاتا ہے۔ متن منتخب التواریخ (ج ۳ ص ۲۰۰-۲۰۱) میں "فتح بہروج کردند" (= ۹۸۲) اسی وجہ سے نفیسی صاحب کو غلط فہمی ہو گئی ہے، منتخب التواریخ ہی میں اس کی صراحت موجود ہے، کہ "لفظ بہروج در ہر دو مصراع باسقاط واو" لہذا اس تاریخ کی رو سے یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ ۹۷۶ تک زندہ تھا، (نہ کہ ۹۸۲ تک جو نتیجہ نفیسی صاحب نے نکالا ہے)

اس کے بعد کی بھی ایک تاریخ نفائس المآثر (نسخہ رامپور) نکلتی ہے :

"و در تاریخ جدا شدن جمعے از اہل خراسان و عراق کہ سمت سیادت داشتند و از میرزایان

جدائی نمودہ بودند گفتہ بود،

خوردند باہم صحبت ارباب رفض — آن قدح بشکست و آں ساقی نماند
سال تاریخش بر سبیل تعمیہ — یافتم از "رافضی باقی نماند"

(۱۰۹۱ - ۱۱۳ = ۹۷۸)

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ۹۷۸ تک زندہ رہا، اور نفیسی صاحب نے جو دوسری روایت بیان کی ہے اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں،

ترجمہ تردی بیگ رودہ کے آخر میں نفائس المآثر نے لکھا (جو نفیسی صاحب کو بقول خود معلوم نہیں تھا) کہ

"بعد از انہدام الغ میرزایان بدکن رفتہ و از آنجا متوجہ مکہ معظمہ شد"

نفائس المآثر نے تردی رودہ کی موخر الذکر رباعی کے جواب میں مولانا ساقی کی حسب ذیل رباعی بھی درج کی ہے:

بر تردی دو رخ ابتر او لعنت — بر شعر بد مکرر او لعنت
کردہ است باولاد نبی نسبت رفض — بر رافضی و بر پدر او لعنت

۱۱- ملا نور الدین محمد ترخان (نفیسی ج ۱ ص ۵۴۲) "متخلص بنوری"

نفائس المآثر (برگ ۴۰ (الف) علی گڑھ) میں جو اشعار دیئے ہیں ان میں ترخان ہی تخلص کیا ہے، مثلاً :-

ترخان ببزم شاہ گدا را چو نیست راہ — زان بنوا بکلبۂ احزاں نشستہ ایم

دوسری بات یہ ہے کہ نفیسی صاحب کے بیان سے کہیں شاعر کی عمر کا اندازہ نہیں ہوتا، نفائس المآثر نے خود اس کی تحریر درج کی ہے،

"بتاریخ سنهٔ خمس و سبعین و تسعمایة که سنین عمر قریب بستین رسیده"

۱۲- ثنائی (خواجہ حسین) (نفیسی ج ۲ ص ۸۱۹)

"در دربار اکبر زیسته و تا ۹۷۰ زنده بوده است"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نفیسی صاحب نے اس کی تاریخ وفات کے بارے میں کوئی جستجو نہیں کی، حالانکہ مختلف تذکروں میں پائی جاتی ہے،

مآثر رحیمی (ج ۳ ص ۳۵۴) "بتاریخ نہصد و نود ہجری از دار فنا بعالم بقا در ہندوستان خرامید و در دار السلطنت لاہور مدفون گشت و میرزا باقر ولد میر عرب شاہ مشہدی کہ خانوادہ موحی الیہ بود نعش خواجہ را از لاہور بمشہد مقدسہ رضویہ نقل نمودہ و در آن آستان مدفون گشت"

خوشگو اور ہمیشہ بہار نے ۹۹۵ لکھا ہے اور استشہاد میں ملا کامی سبزواری کا کہا ہوا ایک مادہ تاریخ بھی "سخنور نیک" (= ۹۹۶) نقل کیا ہے، میخانہ (ص ۲۰۵) نے ۹۹۵ کو صحیح مانا ہے، حالانکہ باعتبار زمانہ اور مرتبہ عبدالباقی نہاوندی (صاحب مآثر رحیمی) کا بیان زیادہ معتبر ہے، دوسری بات یہ ہے کہ وہ خود ایک بات پر قائم نہیں، اُن کے بیان اور استشہاد میں ایک عدد کا فرق ہے، مسٹر ولسلی ہیگ مترجم منتخب التواریخ جلد سوم (ص ۱۸۸) نے معلوم نہیں کس بنا پر ثنائی کا سنہ وفات .... لکھدیا ہے،

۱۳- میر سید علی جدائی تبریزی (نفیسی ج ۱ ص ۴۴۴ و جلد ۲ ص ۸۳۰) "از نقاشان ہنرمند ساکن ہندوستان بود در جوانی از تبریز بدانجا رفت و در دربار جلال الدین اکبر کارش بالا گرفت" اگرچہ دو جگہ تذکرہ کیا ہے، مگر کوئی تاریخ درج نہیں کی، جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ کس دور میں ہندوستان آیا،

نفائس المآثر (ورق ۵۲ ب، علی گڑھ) "اصل ایشان از ترمذ است بعض اوقات اجداد وے در بدخشان می بودہ اند..... در بدو حال و ایام شباب در عراق نشو و نما یافتہ، و در شہور سنہ ست و خمسین و تسع مایة بکابل آمدہ بشرف ملازمت حضرت جنت آشیانی سرافراز گشتہ"

۱۴- فضل اللہ جمالی دہلوی (ج ۱ ص ۳۱۲) "از معاریف شعرای متصوف ہندوستان و اصحاب شیخ سماء اللہ دہلوی عارف متوفی ۹۰۱ بودہ خود در اواخر قرن دہم می زیست و سفرہای بسیار کردہ، در ۹۲۲ یا ۹۲۵ درگذشتہ"

شیخ جمالی دہلوی (ج ۱ ص ۴۶۵) "در طریقت مرید خال خویش شیخ بہاء الدین کنبوہ بودہ .... سرانجام در ۹۲۵ در دہلی درگذشتہ"

جمالی دہلوی (ج ۲ ص ۸۰۸) "در بارۂ نام و نسب وے اختلاف است برخی نوشتہ اند جلال خان متخلص بجلالی و سپس بتوصیہ مرشد خود شیخ سماء الدین جمالی تخلص کردہ۔ برخی دیگر او را حامد بن فضل اللہ نوشتہ نیز نوشتہ اند معروف بحاجی جلال خان یا درویش جمالی و یا شیخ ملا جمالی کنبوہ بودہ است، و اینکہ تاریخ مرگش را ۹۲۲ و ۹۲۵ نوشتہ اند درست نیست، سیر العارفین را در میان سالہای ۹۳۷ و ۹۴۳ تالیف کردہ"

حامد بن فضل اللہ جمالی کنبوہ دہلوی (ج ۱ ص ۴۰۴) "معروف بدرویش جمالی ...... نام وے برخی فضل اللہ دانستہ اند..... نخست جلالی تخلص می کردہ و در ۹۰۱ مرشدش سماء الدین بوے تخلص جمالی دادہ است...... سرانجام در ۱۰ ذوالقعدہ ۹۴۲ در دہلی درگذشتہ"

جب نفیسی صاحب کو یہ معلوم تھا کہ جمالی نے کتابیں لکھی ہیں، تو ایک سیدھا راستہ یہ تھا کہ اُن پر ایک نظر ڈال لیتے تو جمالی کے نام و نسب اور تخلص کے متعلق جو الجھنیں پیدا ہوئیں، وہ نہ ہوتیں، باقی امور یعنی وفات وغیرہ کی اطلاع تو وہ معاصر اور قریب العصر ماخذوں میں تلاش کرلیتے،

اسی طرح آسانی سے اس کا ترجمہ حال تیار ہو جاتا، خاکسار کی ایک عزیز شاگرد، اختر بانو نے جمالی دہلوی پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا ایک مقالہ لکھا تھا (جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے) ذیل میں اس سے استفادہ کیا جائے گا، (مقالے کی زبان فارسی ہے):۔

"حاجی سید حامد بن فضل اللہ قریشی، زبیری، سہروردی، کمکو، عربی، ثم سندی، ثم کنبوی، ثم ملتانی، ثم بیانوی، ثم دہلوی، المتخلص بجمالی، المشتہر شیخ جمالی و بدرویش جمالی المتوفی ۹۴۲ ہجری قمری (مقالہ ص یک)

حاجی، یہ بزرگ شاعر سیاح تھا، اور دوران سیاحت حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوا تھا جیسا کہ اس نے خود سیر العارفین (مطبع دہلی، ۱۳۱۱ ہجری ص ۳) میں لکھا ہے۔

سید و قریشی و زبیری، اس خاندان کا سلسلہ نسب جو تاریخ ابن خلدون (ص ۲۰۳-۳۱۲) وسیرۃ النبی ۱۱۰/۸، ۱۲۲، اور المشاہیر تالیف منشی فیض احمد زبیری، کنبوی مطبوعہ ای میرٹھ ص ۲۸ (نسب نامہ حضرت مخدوم شیخ سماء الدین بحوالہ مصباح العاشقین تالیف شیخ زین العابدین عرف ادھن) و خاندان زبیری کنبوی تالیف حسین احمد ص ۱۸۱ شجرہ خواجہ فتح اللہ زبیری کی مدد سے تیار ہوا ہے، جمالی کا سلسلہ نسب حضرت زبیرؓ تک پہنچتا ہے اور اسکے معاصرین سید بھی اس خاندان کا احترام کرتے تھے، چنانچہ شجرہ سہروردیہ (احمد خاں اکبر شاہی کنبوی زبیری ص ۳۶-۳۷) میں لکھتے ہیں

"ایک مرتبہ مخدوم شیخ سماء الدین (جو جمالی کے مرشد حقیقی و چچا زاد بھائی اور خسر تھے) ضعیفی میں پالکی پر سوار ہوا کرتے تھے، اولاد، خدام، اور مریدوں کی کثیر تعداد ان کے ساتھ تھی، اسی درمیان میں سید عبدالوہاب بخاری کا بھی ادھر سے گزر ہوا، گھوڑے سے اتر پڑے، اپنا کندھا پالکی کے ڈنڈے کے نیچے رکھدیا، حضرت مخدوم نے کہاروں کو حکم دیا کہ پالکی زمین پر رکھدیں، اور فرمایا، "ادب سیادت باقی ست"

حامد بن فضل اللہ درویش جمالی: جمالی نے خود اپنی شہرۂ آفاق تصنیف سیر العارفین ص ۳ میں لکھا ہے:۔

"حامد بن فضل اللہ الراجی الی حضرت المتعال والمعروف بدرویش جمالی"

حسین احمد زبیری نے خاندان زبیری کنبوی میں ایتھے اور ریو نے اسی نام کی تکرار کی ہے، جن اختلافات کا نفیسی صاحب نے ذکر کیا ہے، بعد کی پیداوار ہے، اور اس کی تفصیل بے فائدہ ہے۔

سہروردی: جمالی نے خود سیر العارفین (ص ۱۰۳-۱۰۵) میں تفصیل سے بتایا ہے کہ اس کا سلسلہ بیعت شہاب الدین سہروردی سے ہے؛

کمکو: حسین احمد زبیری خاندان زبیری کنبوی (ص ۲۳۱-۲۳۲)

"کمکو ترکی لفظ، کیا کم کا مخفف یا محرف ہے، جس طرح ایک اور ترکی لفظ کموتائی مخفف یا محرف ہو کر کموتے بولا اور لکھا جاتا ہے، (مدینہ اخبار بجنور ۲ مارچ ۱۹۳۹ء) کیا کم یا کمکو کے معنی مدیر یا متصرف یا وزیر یا حاکم صوبہ کے ہیں، (دیکھو تفصیلی کا میدان مصنف سر اسٹمبار ٹلٹ پارلیمنٹ انگلستان مترجمہ مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور ص ۲۴۲) اس زبیری کنبوی خاندان کا جس میں ہم لوگ ہیں اور ترکی سلطنت غزنویہ نیز ترکوں کی سلطنت اسلامیہ دہلی کے قیام سے مغل سلطنت کی ابتری تک مسلسل وزراء، امراء، سپہ سالار، گورنر، دبیر، شرف، شیخ الاسلام، قاضی اور مفتی وغیرہ وغیرہ ہوتے رہے ہیں، کسی ترکی خانوادہ کی سلطنت میں کمکو یعنی خاندان وزراء کے لقب سے ملقب ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔" آگے کہتے ہیں کہ

"قوم کنبوہ میں ۹۷ وزراء و حکما، و امراء، گورنر، سپہ سالار، فوجدار، مشائخ طریقت، علمائے شریعت اور اطباء ہوئے ہیں" (ص ۲۶)

سندی: خاندان زبیری کنبوی (ص ۱۷) حضرت زبیرؓ کی اولاد میں جو لوگ

حواری رسول تھے، مجبور ہوئے کہ سندھ میں منتقل ہو جائیں تاکہ وہاں کا حاکم محمد نفس زکیہ بن عبد اللہ بن حسن مثنیٰ بن حضرت حسنؓ بن حضرت علی علیہ السلام سے بیعت ہو جائے۔

کنبوی و ملتانی۔ خاندان زبیری کنبوی (ص ۳۲۵ - ۳۳۵)

"کنبایا کنباہ یا کنبایہ سندھ کا ایک شہر ہے، ابراہیم و عیسیٰ بن مصعب بن سید نا زبیر و محمد نفس زکیہ کی شہادت کے بعد زبیری خاندان کنبایا کنباہ یا کنبایہ میں منتقل ہو گیا، ۳۰۳ھ میں ترک وطن کر کے ملتان آئے تو زبیری بھی وہاں پہنچ گئے،

بیانوی: سیر العارفین (ص ۱۰۵) و شجرۂ سہروردو خاندان زبیری کنبوی (ص ۱۴۰) کے متفقہ بیان کے مطابق "مخدوم شیخ سماء الدین قدس سرہ ملتان سے نقل وطن کر کے بیانہ (نزد تھنبور کے قریب) اپنے بڑے بھائی اسحاق اور جمالی کے ساتھ جا کر رہنے لگے، ایک مدت تک وہاں رہے، اس کے بعد دہلی آ گئے، لیکن عرصۂ دراز تک بیانہ سے رابطہ قائم رہا۔"

تخلص: جلالی تخلص کا اب تک کوئی ثبوت نہیں ملا، البتہ کچھ تذکرہ نویسوں مثلاً شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار (ص ۲۲۱) اور صمصام الدولہ نے مآثر الامراء میں لکھا ہے، خود جمالی کی تصنیفات میں جمالی ہی ملتا ہے:-

مہر و ماہ:- بحمد اللہ ز نفضل لایزالی جہاں را مرشد دیں شد جمالی

مرآۃ المعانی: از جمالش شد جمالی آفتاب زاں جمالی را جمالی شد خطاب

دیوان: جمالی در رہ شیدائی دیوانہ وقت بسودای دگر افتادہ فارغ گشتہ زیں غوغا،

اسم مرشد: جمالی کے مرشد کا نام سماء الدین ہی تھا، جس کا اس سے بہتر ثبوت نہیں ہو سکتا جیسا کہ نفیسی صاحب نے لکھا ہے، مرشد کا انتقال ۹۰۱ھ میں ہوا، جمالی نے قطعۂ تاریخی کہا تھا،

مرشد انس و ملک شاہ سماء الدین چو رفت ای جمالی بر سریر عرش آمد گام او

ہشت خلد آمد بنام او اگر پرسد کسی سال تاریخش بگو ہشت، آمدہ بر نام او

۱۹۶ قیمت سماء الدین
۷۰۵ قیمت ہشت
۹۰۱

مرشد سے خاندانی رشتے: منشی فیض احمد زبیری کنبوی نے المشاہیر (ص ۲۰) میں مصباح العاشقین تالیف شیخ زین العابدین عرف ادھن کے حوالے سے حضرت مخدوم شیخ سماء الدین کا جو شجرہ نسب دیا ہے، یعنی:-

خواجہ فتح اللہ (رئیس ملتان)

- خواجہ فخر الدین عرف بدھ
  - شیخ محمد اسحاق
  - سماء الدین
- خواجہ فضل اللہ
  - شیخ جمالی دہلوی
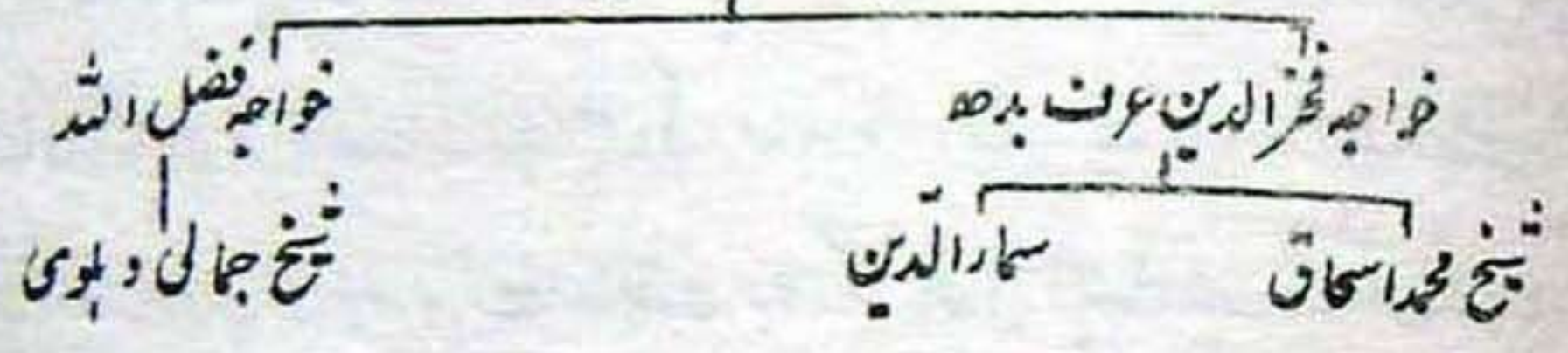
بی بی زینب زوجۂ جمالی،

اس اعتبار سے سماء الدین جمالی کے حقیقی چچا زاد بھائی اور خسر تھے،

موخر الذکر قرابت کی تصدیق نعمت اللہ ہروی کی تاریخ جہانبانی مخزن افغانی (ص ۱) سے ہوتی ہے:-

"سلطان رقعہ دیگر با نیاز تمام بہ قطب فلک ہدایت شیخ سماء الدین کنبو کہ پیر شیخ جمالی و صبیۂ ایشاں نیز در حبالۂ عقد شیخ جمالی بود نوشت۔"

تیسرا رشتہ یعنی یہ کہ سماء الدین جمالی کے خال (ماموں) یا خالو تھے، اس میں خود جمالی یا کسی قریب العصر ماخذ سے تصفیہ کن جواب نہیں ملتا، البتہ شیخ محمد اکرام نے "آب کوثر" (ص ۵۲۴) میں لکھا ہے:-

"لیکن پھر اپنے پیر بزرگوار اور خالو مولانا سماء الدین کے ایماء پر جمالی تخلص اختیار کیا۔"

شیخ یٰسین نیازی نے اپنے مقالے "سکندر لودی اور اس کے بعض مصنفین ..." اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۳۲ء ص ۱۳۵) میں لکھا ہے کہ سماء الدین جمالی کے پیر اور خالو تھے ؛

حسین علی خاں نے "نشتر عشق" (ص ۸۰۹) میں سماء الدین کو جمالی کا خال لکھا ہے ،

رضا قلی ہدایت نے بھی ریاض العارفین میں بجائے سماء الدین کے بہاء الدین اور رشتہ خال (ماموں) لکھا ہے ،

شجرۂ سہروردیہ میں شیخ سماء الدین کی ولادت ۸۰۸ھ لکھی ہے ،

۱۵- حسینی ہروی غوری (نفیسی ج ۱ ص ۱۶۹ و ج ۲ ص ۸۴۲) دونوں جلدوں میں اس کی وفات ۹۰۱ھ درج کی ہے ، جس کی اس مادۂ تاریخ "طاب ثراہ" (نفحات الانس جامی لیسی اودوار ڈبرون ص ۲۲۴) سے مطابقت ہے ، مگر حسینی کی ایک تالیف کے متعلق لکھا ہے (نفیسی) "نزہت المجالس در ۹۱۲ بپایاں رسانیدہ" خلاف قیاس ہے ،

۱۶- حیدری تبریزی (نفیسی ج ۱ ص ۴۲۷ و جلد ۲ ص ۸۲۲) کا بھی دونوں جلدوں میں ذکر کیا ہے ، لیکن نہ اکبر کے سوا اس کے کسی مربی کا ذکر کیا ہے ، اور نہ اس کے متعلق کوئی تاریخ لکھی ہے ؛

نفائس المآثر (برگ ۵۸ (الف) علی گڑھ) در سنہ اثنی وستین وتسعمایۃ بزیارت حرمین شریفین ...... مشرف گشتہ از راہ دریا باز بدیار ہند آمد و در سلسلۂ نواب میرزا کوکہ بود ؛ قصیدہ در مدح نواب ..... گفتہ ایں مطلع آنست"

بنزد اہل سخن چوں کنم بیان سخن اگر مدد نکند روح صاحبان سخن

درحضور جامع اوراق بر ممدوح خواند ، بیست تومان نقد و سروپا و اسپ ولائق بصلہ عنایت کردند"

انگریزی ترجمہ منتخب التواریخ جلد سوم (ص ۲۰۲) حیدری تین بار ہندوستان آیا ، ایک بار جب جوان تھا ، محمد قاسم خاں نیشاپوری سے وابستہ رہا ، دوسری بار میرزا عزیز کوکہ اور تیسری بار عبدالرحیم خانخاناں کے ساتھ گجرات کی مہم پر گیا ، جب حیدری کاشان واپس آیا تو تا خضر نہاوندی کے ساتھ رہا ، جو اس وقت وہاں کا حاکم تھا ، جب تبریز کو رومی ترکوں نے خراب کر دیا تھا تو حیدری عراق میں "نطنز" نامی ایک جگہ مقیم ہو گیا ، اور وہاں سنہ الہزار دو ہجری میں انتقال کر گیا ، اس نے سامری نام کا ایک لڑکا چھوڑا تھا ، جو باپ کے انتقال کے بعد ہندوستان آیا ، اور خانخاناں نے اس کو اپنا میر ساماں بنا لیا ، دکن کی جنگ میں شہنواز خاں کے ساتھ قتل ہو گیا"

۱۷- حرفی اصفہانی (نفیسی ج ۱ ص ۴۴۴) "بقزوین رفتہ و ہفت بند معروف حسن کاشانی را در آنجا جواب گفتہ و شاہ صلۂ گرانی بوے دادہ و سفری بگیلان کردہ و در آنجا درباره احمد زیدیہ بدگوئی کردہ و زبانش را بریدہ اند"

نفائس المآثر (برگ ۵۹ (الف) علی گڑھ) عباس سلطان قطع زبان حرفی نمود بعد از وقوع ایں امر ہمچناں در طلاقت و بلاغتش قصوری نشدہ ...... در سنہ سبعین وتسعمایۃ بقزوین آمدہ ہفت بند ملا حسن کاشانی را جواب گفتہ بود از شاہ طہماسپ پنج تومان و سروپا در جائزہ گرفت"

۱۸- زلالی ہروی کا (نفیسی ج ۱ ص ۳۲۶) ترجمۂ حال دیا ہے تاریخ وفات نہیں دی ،

نفائس المآثر (برگ ۷۷ (ب) علی گڑھ) در سنہ احدی وثلثین وتسعمایۃ"

(باقی)

حضرت علیؓ کے کلام سے ادبائے عرب کا استفادہ

از

جناب سید محمود حسن قیصر امروہوی ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

عرب کے دوسرے خطباء | ابن نباتہ کے علاوہ دوسرے ادباء اور خطباء کے یہاں بھی بکثرت ایسی مثالیں ملتی ہیں، کہ انھوں نے شعوری اور غیر شعوری طور پر امیر المومنین کے کلام سے استفادہ کیا ہے، اور اپنے کلام میں بلندی پیدا کرنے کی غرض سے آپ کے الفاظ اور جملوں کو اپنایا ہے، کچھ ایسی مثالیں بھی ہیں، کہ آپ کے پورے پورے خطبے لوگوں نے مجمعِ عام میں پڑھے ہیں، ذیل میں کچھ مثالیں درج کرتا ہوں:-

۱۔ ایہا الناس انما الدنیا دارُ مجازٍ والآخرۃ دار قرار فخذوا من ممرکم لمقرکم[1]

بیشک دنیا گذرگاہ ہے، اور آخرت قرارگاہ، پس اپنی گذرگاہ سے اپنی قرارگاہ کے لئے توشہ حاصل کرو۔

امیر المومنینؓ کا یہ پورا خطبہ ایک اعرابی نے اپنے نام سے پڑھا ہے، چنانچہ ابو اسماعیل قالی متوفی ۳۵۶ھ نے اس کو اسی طرح روایت کیا ہے[2]

[1] نہج البلاغۃ (۲: ۲۰۹، رقم ۱۹۰)، [2] الامالی القالی (۱: ۲۵۳، القاہرہ، ۱۹۲۶ء)

وحدثنا ابو بکر رحمہ اللہ، قال اخبرنا عبد الرحمان عن عمہ قال ولّی جعفر بن سلیمان اعرابیا بعض میاھھم فخطبھم یوم الجمعۃ، فحمد اللہ واثنی علیہ، ثم قال:-

ہم سے ابو بکر رحمہ اللہ نے عبد الرحمان کی زبانی، انھوں نے اپنے چچا سے سُن کر بیان کیا کہ ایک مرتبہ جعفر بن سلیمان نے کسی قبیلے میں ایک اعرابی کو والی بنایا، اس نے جمعہ کے دن لوگوں کو خطبہ دیا، پس اللہ کی حمد و ثنا کے بعد اس طرح بیان کیا:

اما بعد: فان الدنیا دار بلاغ والآخرۃ دار قرار فخذوا المقرکم من ممرکم ولا تھتکوا استارکم عند من لا یخفیٰ علیہ اسرارکم، واخرجوا من الدنیا قلوبکم ...... الخ

اما بعد! بیشک دنیا دار التکلیف اور آخرت قرارگاہ ہے، پس تم اپنی گذرگاہ سے اپنی قرارگاہ کے لئے توشہ حاصل کرو، اور اپنے پردوں کو اس پر چاک نہ کرو جس سے تمہارے بھید پوشیدہ نہیں ہیں، اور اپنے دلوں کو دنیا سے نکال لو۔۔۔

۲۔ اتقوا ظنون المومنین فان اللہ جعل الحق علی السنتھم ......[1]

مومن کے ظن سے ڈرو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی زبانوں پر حق جاری کیا ہے۔

علامہ ابن عبد البر متوفی ۴۶۳ھ (۱۰۷۱ء) نے یہ قول خفیف لفظی فرق کے ساتھ ابو مسلم

[1] نہج البلاغۃ (۳: ۲۲۷، رقم ۳۰۹)

خولانی سے حسب ذیل طریقہ پر روایت کیا ہے:[۱]

اتقوا ظنّ المومن، فانّ	مومن کے گمان سے بچو، کیونکہ
الله تعالیٰ جعل الحق علی لسانہ	اللہ تعالیٰ نے حق اس کی زبان اور
وقلبہ،	دل پر جاری کر دیا ہے،
ایّھا النّاس! انما انتم	اے لوگو! بیشک تم اس دنیا
فی ھذہ الدنیا غرض تنتصل	میں نشانہ ہو جس پر موت تیر لگاتی
فیہ المنایا،.....[۲]	ہے،

یہ خطبہ ابو اسماعیل نے اموی خلیفہ عمر بن عبد العزیزؒ کے نام سے اس طرح روایت کیا ہے:[۳]

وحدثنا ابو بکر بن الانباری	ہم سے ابو بکر بن الانباری، انھوں نے
قال حدثنی ابی، قال احمد ثنا	اپنے باپ سے، انھوں نے احمد بن
احمد بن عبید، قال:- حدثنا	عبید سے زنادی کی زبانی روایت
الزّنادی، قال: یقال ان عمر	کیا ہے، زنادی کا بیان ہے کہا
بن عبد العزیز رحمہ الله	جاتا ہے کہ عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ
تکلم بھذا الکلام فی خطبتہ	نے اپنے خطبہ میں یہ کلام بیان کیا
"انّما الناس فی الدنیا اغراض	تھا: بیشک لوگ اس دنیا میں
....."	نشانہ ہیں،

[۱] بہجۃ المجالس وانس المجالس مخطوطہ باب الظن والذکاوۃ [۲] نہج (۳: ۱۹۶، رقم ۱۹۱)
[۳] نہج (۳: ۱۹۷، رقم ۱۹۱)

الا وانّ الیوم المضمار	آگاہ ہو جاؤ! آج مقابلہ اور کل
وغدًا السباق، والسبقۃ	جیت کا دن ہے، دوزخ ہدف اور
الجنۃ والغایۃ النار.....[۱]	اس کو پار کر لینے والوں کی منزل

مذکورۂ بالا کلام نہج البلاغہ کے ایک مشہور خطبے کا ٹکڑا ہے، ابن عجلان کا بیان ہے کہ عون[۲] ابن عبد اللہ بن عتبہ اکثر یہ کلام پڑھا کرتے تھے، چنانچہ حافظ ابو نعیم اصفہانی نے اس کو اس طرح روایت کیا ہے:[۳]

حدثنا ابراھیم بن عبد الله ثنا محمد بن اسحاق ثنا قتیبۃ بن سعید ثنا اللیث بن سعد، عن ابن عجلان، عن عون، انّہ کان یقول: "الیوم مضمار وغدًا السّباق والسّبقۃ الجنۃ والغایۃ النار"

الفاظ بالا کے آگے جو مزید الفاظ ہیں، ان کا مفہوم یہ ہے کہ تم معافی کے ذریعہ نجات پاؤ گے، رحمت کے ذریعہ داخل (جنت) ہوگے، اور اعمال کے مطابق منزلوں میں منقسم ہوگے،

۵- لا یزھدنّک فی المعروف	کوئی شخص اگر تیرا شکر گزار نہ ہو تو یہ
من لا یشکرہ لک فقد یشکرک علیہ	بات تجھ کو بھلائی سے نہ روکے اس لئے
من لا یستمتع بشیئٍ منہ، وقد	کہ تیری بھلائی پر وہ شکر گزار ہوگا
یُدرک من شکر الشاکر	جو اس سے کسی فائدہ کا طالب نہیں
اکثر مما اضاع الکافر، والله	ہے اور کبھی شکر کرنے والے کے
یحبّ المحسنین،[۴]	شکر سے اتنا مل جاتا ہے، جو اس سے

[۱] نہج (۱: ۷۴، رقم ۲۷) [۲] طبقۂ اولیٰ کے تابعین میں ہیں، حافظ ابو نعیم اصفہانی نے ان کا تذکرہ کیا ہے [۳] حلیۃ الاولیاء (۴: ۲۴۶)، [۴] نہج البلاغۃ (۳: ۱۹۹، رقم ۲۰۴)

بہت زیادہ ہوتا ہے، جتنا کافر نعمت نے اپنی ناشکری کی بنا پر ضائع کیا ہے، اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے،

ابن عباسؓ نے یہ قول اس طرح لیا ہے:[1]

لا یزھدنک فی المعروف کفر من کفرہ فانہ یشکرک علیہ من لم یصنعہ،

ناشکرے کی ناشکری تم کو نیکی سے باز نہ رکھے کیونکہ نیکی پر تمہارا وہ شخص بھی شکر گزار ہوتا ہے جو نیکی نہیں کرتا،

۶۔ ان ھذہ القلوب تمل کما تمل الابدان، فابتغوا لھا طرائف الحکمۃ[2]

یہ دل بھی اسی طرح تھک جاتے ہیں جس طرح جسم، پس ان کے لئے تازہ بتازہ حکمتیں حاصل کرو،

امیر المومنین کا یہ قول نظماً اور نثراً دونوں طرح لوگوں نے اپنایا ہے، علامہ ابن عبدالبر اس قول کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں[3]

قال بعضھم: روحوا الاذھان کما تروحوا الابدان، وقال بعضھم: روحوا القلوب بروائع الذکر[4]

بعض لوگوں نے اس کو اس طرح ادا کیا ذہنوں کو اسی طرح راحت وفرحت پہنچاؤ، جس طرح جسموں کو پہنچاتے ہو، بعض لوگوں نے یوں

۱؎ بہجۃ المجالس وانس المجالس (باب المعروف) ۲؎ نہج البلاغۃ (۳: ۱۷۰، رقم ۱۹۱ و ۱۹۷)
رقم ۱۹۰- ۳؎ بہجۃ المجالس وانس المجالس،

بیان کیا ہے، روائع ذکر سے دلوں کو راحت وفرحت پہنچاؤ،

۷۔ الق دواتک، واطل جلفۃ قلمک وفرج بین السطور وقرمط بین الحروف، فان ذالک اجدر بصباحۃ الخط

دوات صاف رکھو، قلم کی زبان لمبی ہو، سطروں کے درمیان فاصلہ رہے، اور حروف کو ملا کر لکھو، اس لئے کہ یہ بات تحریر کے نکھار کا سبب ہے،

آداب کتابت میں امیر المومنین کا یہ بنیادی قول ہے، قریب قریب یہی ہدایت کتابت کے بارے میں اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے اپنے عمال کو لکھ کر بھیجی تھی، ابن عبدالبر کی روایت کی بنا پر ان کے الفاظ یہ ہیں:[2]-

اذا کتبتم، فارقوا الاقلام واقلوا الکلام واقتصروا علی المعانی وقاربوا بین الحروف،

جب تم لکھو تو قلم کو باریک کرو، کلام کم ہو اور معانی زیادہ، اور حروف کو ملا کر لکھو،

۸) مالابن آدم والفخر، اولہ نطفۃ وآخرہ جیفۃ[3]

آدم کا بیٹا کس بات پر فخر کرسکتا ہے جس کا اول نطفہ ہے اور آخر مردار،

مالک بن دینار نے اسی قول کو اس طرح دہرایا ہے:[4]

"کیف یتیہ من اولہ نطفۃ مذرۃ وآخرہ جیفۃ قذرۃ"

۹) احذروا صولۃ الکریم

بھوکے شریف اور پیٹ بھرے

۱؎ نہج البلاغۃ (۳: ۲۲۸، رقم ۳۱۵ ۲؎ بہجۃ المجالس (باب الکتابۃ والکتاب،
۳؎ نہج البلاغۃ (۳: ۲۴۰، رقم ۴۵۴ ۴؎ بہجۃ المجالس باب الکبر والتکبر،

اذا جاع واللئیم اذا شبع ،[۱]	کمینے سے بچو ،

امیر المومنین کا یہ قول امیر معاویہؓ کے یہاں ملتا ہے علامہ ابن عبد البر لکھتے ہیں کہ عمرو بن العاصؓ نے جب مصر جانے کا ارادہ کیا تو اس موقع پر امیر معاویہؓ نے ان کو جو وصیت کی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:-[۲]

"استوحش من الکریم الجائع	بھوکے شریف اور شکم سیر کمینہ سے
ومن اللئیم الشبعان ، فانما	گھبراؤ کیونکہ شریف اس وقت
یصول الکریم اذا جاع : اللئیم	حملہ کرتا ہے جب بھوکا ہوتا ہے ، اور
اذا شبع	کمینہ اس وقت جب شکم سیر ہوتا ہے ،

بعض مثالوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عرب آپ کے کلام کو غیر شعوری طور پر بھی استعمال کرتے تھے ، جس سے اس کی مقبولیت اور شہرت عام کا پورا پورا اندازہ کیا جاسکتا ہے ، مثلاً ابن ابی الحدید لکھتا ہے[۳] کہ ایک مرتبہ حجاج بن یوسف نے خطبہ دیا ، جس میں اس نے طلاقِ آخرت پر لوگوں کو ابھارا ، حسن بصری نے اس کی زبان سے یہ خلاف توقع کلام سنا تو کہنے لگے :

هذه ضالة المومن خرجت	یہ مومن کی گم شدہ چیز ہے ، جو منافق
من قلب المنافق "	کے دل سے نکلی ہے ،

اسی مضمون کا ایک قول ابو حمزہ خارجی کا ہے ،

ضالة المومن علی لسان	مومن کی گم شدہ چیز منافق

---

[۱] نہج البلاغۃ (۳ : ۱۶۳ ، رقم ۴۸ ، [۲] بہجۃ المجالس قلمی (باب السلطان والسیاسۃ)

[۳] شرح ابن ابی الحدید (۱۸ -: ۲۲۵)

المنافق ،	کی زبان پر ،

اسی طرح کا ایک واقعہ ابن عبد ربہ الاندلسی نے نقل کیا ہے ،[۱]

" العتبی ، قال : قال عبد اللہ	عتبی کی روایت ہے ، کہ عبد اللہ
بن الاهتم : مات لی ابن و	ابن الاہتم کا بیان ہے کہ میرے لڑکے
انا بمکۃ ، فجزعت علیہ جزعا	کا انتقال ہو گیا ، اس وقت میں
شدیدا ، فدخل علی ابن جریج	مکہ میں تھا ، اس کے غم نے مجھے
لتعزیتی ، فقال لی : یا ابا محمد !	بہت بے چین کیا ، ابن جریج میرے
سل صبرا واحتسابا ، قبل	پاس تعزیت کے لئے آئے ، اور
ان تسلو غفلۃ ونسیانا کما	کہا ، اے ابو محمد ! صبر کرو قبل
تسلو البهائم ،	اس کے کہ غفلت ، اور بھول کے
	طور پر صبر کرنا پڑے ، جس طرح
	جانور صبر کر کے بیٹھ جاتے ہیں ،

مذکورۂ بالا قول امیر المومنین کا ہے ، جو آپ نے اشعث بن قیس کی تعزیت کے موقع پر ارشاد فرمایا ہے ، جو نہج البلاغۃ میں اس طرح وارد ہوا ہے ،[۲]

ان صبرت صبر الاکارم ،	اگر شریفوں کی طرح صبر کرو گے تو
والا سلوت سلو البهائم	بہتر ہے ورنہ جانوروں کی طرح
	چپ ہونا پڑے گا ،

---

[۱] العقد الفرید ۲ - ۳۳ ،

[۲] نہج البلاغۃ ، ۳ ، ۲۵۲ ، رقم ۴۱۴ ،

شعراء خطباء اور ادباء کی طرح شعراء نے بھی حضرت علیؓ کے کلام سے پورا فائدہ اٹھایا ہے، اور ان کے اقوال و حِکَم کو کثرت کے ساتھ مختلف طریقوں سے نظم کیا ہے جس سے عربی ادب کی کتابیں بھری پڑی ہیں، اگر عربی نظم و نثر کے تمام قدیم مصادر کا جائزہ لیا جائے، تو اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ ذیل میں نمونے کے طور پر کچھ مثالیں درج کی جاتی ہیں،

۱۔ أَلا اِنَّ الدُّنیا......
فانّها عند ذوی العقول
کفی الظلِّ، بَیْنا تراه سابغ
حتی قلص وزائداً حتی نقص[1]

آگاہ ہو جاؤ، بیشک دنیا... عقلمندوں کے نزدیک سایہ کی طرح ہے، جسے ابھی تو پھیلا ہوا دیکھتا ہے اکہ سکڑ جاتا ہے، اور ابھی بڑھتا ہوا دیکھتا ہے کہ گھٹ جاتا ہے،

ایک شاعر نے یہی مضمون اس طرح نظم کیا ہے[2]،

أَلا إِنَّما الدُّنیا کظلِّ غمامةٍ
اظلّت یسیراً ثمّ خفت فولّتِ

(آگاہ ہو جاؤ! دنیا بادل کے سایہ کی طرح ہے، جو تھوڑا سا پھیلتا ہے، پھر ہلکا ہو جاتا ہے، اور پلٹ جاتا ہے)

۲۔ واحذر کل عمل یرضاه صاحبه
لنفسه ویکرهه لعامة المسلمین[3]

ایسے ہر عمل سے بچو، جسے اس کا کرنے والا اپنے نفس کے لیے پسند کرے اور

۱ے نہج البلاغہ (۱ : ۱۰۴ ، رقم ۷۰ ، ۲ے شرح ابن ابی الحدید ، ۵ : ۱۴۴)
۳ے " " (۲ : ۱۳۲ ، رقم ۷۹)

دوسرے مقام پر یہی مضمون نہج البلاغہ میں اس طرح آیا ہے،

کفاكَ أدبًا لنفسِكَ اجتناب
ما تکرهه من غیرک،[1]

تمہارے نفس کے لئے یہی ادب کافی ہے کہ جس چیز کو تم اپنے غیر کے لئے ناپسند کرو، اس سے خود بھی بچو،

ابو الاسود الدولی متوفی ۶۵ھ نے یہ مضمون اپنے ایک شعر میں اس طرح نظم کیا ہے[2]،

لاتنه عن خلقٍ وتأتی مثله
عار علیک اذا فعلت عظیم

(لوگوں کو اس فعل سے منع نہ کر جو تم خود کرتے ہو، اس لئے کہ منع کرنے کی صورت میں جب تم وہ فعل کروگے تو زیادہ عار کی بات ہوگی)

۳۔ والمُقِلُّ غریبٌ فی بلدته[3]

کم دوستوں والا اپنے شہر میں بھی پردیسی ہوتا ہے۔

اسی مضمون میں دوسرا قول ہے۔

فقد الاحبّة غربة[4]

دوستوں کا مفقود ہونا ہی مسافرت ہے،

اسی مضمون کو دوسری صدی ہجری کے مشہور شاعر خلف الاحمر متوفی ۱۸۰ھ نے اس طرح نظم کیا ہے[5]،

لا تظنّی انّ الغریب هو النائی
ولکنّما الغریب المُقِلّ،

۱ے نہج البلاغہ (۳ : ۲۵۱ ، رقم ۴۱۲ ، ۲ے ادب الدنیا والدین للماوردی : ۲۴ ، ۳ے نہج البلاغہ (۳ : ۱۵۲ ، رقم ۳ ، ۴ے نہج البلاغہ (۳ : ۱۶۵ ، رقم ۶۵) ۵ے شرح ابن ابی الحدید (۱۸ : ۱۰۸)

(یہ خیال نہ کرو کہ مسافر وہی ہے، جو اپنے اہل و عیال سے دور ہو، بلکہ مسافر وہ ہے جس کے دوست کم ہوں)

ایک دوسرے شاعر نے یہی مضمون اس طرح ادا کیا ہے[۵۱]

فلا تحسبی ان الغریب الذی نأی ۔۔۔ ولکن من تنائین عنہ غریب

(یہ خیال نہ کر کہ مسافر وہ ہے جو دور ہو گیا ہو، بلکہ مسافر وہ ہے، جس سے تو نے اختیار کر لی")

۴- اعجز الناس من عجز عن اکتساب الاخوان[۵۲] ۔۔۔ لوگوں میں عاجز ترین وہ ہے جو دوستوں کے حاصل کرنے میں عاجز ہو

یہ مضمون دوسری صدی ہجری کے مشہور شاعر اور ادیب ابن الاعرابی متوفی سن ۲۳۰ھ نے اس طرح نظم کیا ہے[۵۳]

لعمرک ما مال الفتی بذخیرۃ ۔۔۔ ولکن اخوان الصفا الذخائر

(تیری زندگی کی قسم! مرد کے لئے اس کا مال ذخیرہ نہیں، بلکہ اس کے مخلص دوست ذخیرہ ہیں)

۵- اذا قدرت علی عدوک فاجعل العفو عنہ شکراً للقدرۃ علیہ[۵۴] ۔۔۔ دشمن پر جب تم کو قدرت حاصل ہو جائے، تو عفو کو اس حصولِ قدرت کا شکر قرار دو

ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغہ یہ قول نقل کر کے لکھتا ہے کہ میں نے اس مفہوم کو اس طرح

---

[۵۱] شرح ابن ابی الحدید ۱۸ : ۱۱۰) [۵۲] نہج البلاغہ (۳ : ۱۵۳) رقم ۱۱

[۵۳] شرح ۱۸ : ۱۱۳) [۵۴] (۳ : ۱۵۳) رقم ۱۰

نظم کیا ہے،

و ان قدرت علی الاعداء منتصراً ۔۔۔ فاشکر بعفوک عن اعدائک لطفاً

اگر تم کامیاب ہو کر دشمنوں پر قابو پالو ۔۔۔ تو ان کو معاف کر کے کامیابی کا شکر ادا کرو

۶- فاعل الخیر خیر منہ و فاعل الشر شر منہ[۵۵] ۔۔۔ خیر کا بجالانے والا "خیر" سے بہتر ہوتا ہے اور شر کا بجالانے والا "شر" سے بدتر ہوتا ہے،

ابن ابی الحدید نے یہ مضمون اس طرح نظم کیا ہے[۵۶]

خیر البضائع للانسان مکرمۃ ۔۔۔ تنمی و تزکو اذا بادت بضائعہ

فالخیر خیر و خیر منہ فاعلہ ۔۔۔ والشر شر و شر منہ صانعہ

(ترجمہ) انسان کی بہترین پونجی شرافت ہے جو بڑھتی رہتی ہے، اور پاک ہوتی رہتی ہے، جب کہ اس کی تمام دوسری پونجیاں ختم ہو جاتی ہیں پس خیر خیر ہے اور اس پر عمل کرنے والا اس سے بہتر ہوتا ہے، اور شر شر ہے، اور اس کا کرنے والا اس سے برا ہوتا ہے،

۷- قلوب الرجال وحشیۃ، فمن تالفہا اقبلت علیہ[۵۷] ۔۔۔ لوگوں کے دل وحشی جانوروں کی طرح ہوتے ہیں پس جس نے انھیں موہ لیا، اسی کی طرف وہ مائل ہو جاتے ہیں،

ایک شاعر نے اس مضمون کو اس طرح نظم کیا ہے[۵۸]

---

[۵۵] نہج البلاغہ ۳ : ۱۵۹ رقم ۳۲ [۵۶] شرح ابن ابی الحدید (۱۸ : ۱۴۹)

[۵۷] " " ۳ : ۱۶۳ رقم ۵۰ [۵۸] " " " (۱۸ : ۱۸۰)

وانی لوحشی اذا ما زجرتنی — وانی اذا الفتنی لالوف

(میں یقیناً وحشی ہوں، جب تو مجھ کو جھڑکے گا، اور بہت محبت کرنے والا ہوں جب تو مجھ سے محبت کرے گا)

۸۔ احذروا صولة الکریم اذا جاع واللئیم اذا شبع[1] — شریف کے حملے سے بچو جب وہ بھوکا ہو، اور کمینے سے جب وہ شکم سیر ہو،

اسی مضمون کو سامنے رکھ کر متنبی کہتا ہے[2]

اذا انت اکرمت الکریم ملکته — وان انت اکرمت اللئیم تمردا

(اگر تم شریف کی عزت کرو گے، تو اس کو مٹھی میں لے لو گے، اور کمینے کی عزت کرو گے تو وہ متمرد اور سرکش ہو جائے گا)

۹) السخاء ما کان ابتداء، فاما ما کان عن مسئلة فحیاء وتذمم[3] — سخاوت یہ ہے کہ مانگنے سے پہلے عطا ہو، لیکن جو سوال کے بعد ہو وہ شرم اور مذمت سے بچنے کے لئے ہوتی ہے،

اسی مضمون کو ایک عربی شاعر نے دو شعروں میں اس طرح نظم کیا ہے[4]

ان ابتداء العرف مجد باسق — والمجد کل المجد فی استتمامه

مثل الهلال یروق ابصار الوری — حسنا ولکن حسنه لتمامه

---

[1] نہج البلاغہ (۳ : ۱۶۳، رقم ۴۹) [2] دیوان المتنبی (۱ : ۲۸۸) [3] نہج البلاغہ (۳ : ۱۶۳، رقم ۵۳)

[4] بہجۃ المجالس (باب المعروف) شرح دیوان الحماسہ تبریزی (۲ : ۲۶۶)

(ترجمہ) نیکی کا آغاز باعث شرف ہے، لیکن اس کو اتمام تک پہونچانا پوری شرافت ہے،

(جیسے پہلی رات کا چاند نگاہوں کو خوبصورتی کی وجہ سے پسند آتا ہے۔ لیکن اس کی کل خوبصورتی تو اس کے تمام ہونے پر ہے،)

۱۰۔ قیمة کل امرئ ما یحسنه[1] — ہر آدمی کی قیمت اس کا عمل خیر ہے،

امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا یہ قول اتنا مشہور ہے، کہ کثرت کے ساتھ مختلف شعراء نے مختلف طریقوں سے اس کو نظم کیا ہے، ان میں سب سے اہتمام کے ساتھ علامہ ابو الحسن طباطبا العلوی متوفی ۳۲۲ھ نے نظم کیا ہے[2]

۱۔ حسود مریض القلب یخفی انینه — ویضحی کئیب البال عندی حزینه

۲۔ یلوم علی ان رحت فی العلم راغبا — واجمع من عند الرواة فنونه

۳۔ واعرف ابکار الکلام وعونها — واحفظ مما استفید عیونه

۴۔ ویزعم ان العلم لا یجلب الغنی — ویحسن بالجهل الذمیم ظنونه

۵۔ فیا لائمی دعنی اغالی بقیمتی — فقیمة کل الناس ما یحسنونه

(ترجمہ) حاسد دل کا مریض ہوتا ہے، جو اپنی کراہ کو چھپاتا ہے، اور میرے پاس آکر اس کا حزن و الم ظاہر ہو جاتا ہے، (۲) وہ مجھے اس بات پر ملامت کرتا ہے کہ میں علم کے درپے رہتا ہوں اور اہل علم سے فنون علم حاصل کرتا ہوں (۳) پس میں عمدہ اور پست کلام کو پہچانتا ہوں، اور عیون کلام کو جس سے میں فائدہ اٹھاتا ہوں، یاد کر لیتا ہوں، (۴) (حاسد) یہ خیال کرتا ہے، کہ علم استغنا اور بے نیازی پیدا نہیں کرتا، اور جہالت کی بنا پر وہ اپنے مذموم اور فاسد خیالات کو اچھا

---

[1] نہج البلاغہ (۳ : ۱۶۸، رقم ۸۱) (۲) المرزبانی: معجم الشعراء: ۴۶۳۔

[2] البیہقی، المحاسن والمساوی: ۳۹۹، (محاسن الادب)

سمجھ لگتا ہے۔ (۵) پس اے ملامت گر! مجھے چھوڑ دے تاکہ میں اپنی قیمت بڑھاؤں اس لئے کہ لوگوں کی قیمت اُن کے اچھے اعمال ہیں۔

ایک محدث شاعر نے خود آپ کے حوالے سے اس مضمون کو دو شعروں میں اس طرح نظم کیا ہے[1]

قال علی بن ابی طالب — وھو اللبیب الفطن

کلّ امرئ قیمته عندنا — وعند اھل العلم ما یحسن

(ترجمہ) علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا قول ہے، جو صاحب عقل اور جید الذہن ہیں، ہر آدمی کی قیمت ہمارے اور تمام اہل علم کے نزدیک، اس کا نیک عمل ہے۔

خلیل نے یہ مضمون اس طرح نظم کیا ہے[2]

لا یکون العلیّ مثل الدنیّ — لا ولا ذو الذکاء مثل الغبی

قیمة المرء قدر ما یحسن المرء — قضاء من الامام علی

(ترجمہ) بلند آدمی پست آدمی کی طرح نہیں ہوسکتا، نہ ذہین غبی کی طرح، آدمی کی قیمت اس کے عمل خیر کے بقدر ہوتی ہے، یہ امام المسلمین حضرت علیؓ کا فیصلہ ہے۔

عبداللہ بن المعتز العباسی متوفی ۲۹۶ھ کے درباری شاعر محمد بن ابراہیم بن عتاب نے اس مضمون کو اس طرح نظم کیا ہے[3]

لا تلہ عن مصطفی نفیس — واشتر نی فانی عبد ثمن

کلّ امرئ قیمته ما یحسن

[1] الحماسة البصریة: ۳۹۵، [2] الماوردی: ادب الدنیا والدین: ۱۹،

[3] المرزبانی: معجم الشعراء: ۲۶۶،

(ترجمہ) (مجھ سے بے نیازی اختیار نہ کرو ورنہ نقصان میں رہے گا، مجھ کو خرید لے کیونکہ میں ایک قیمتی غلام ہوں، ہر انسان کی قیمت اس کا نیک عمل ہے۔

ابن ابی بکر المقری متوفی ۸۳۷ھ نے اس طرح اس مضمون کو نظم کیا ہے[1]

وقیمة المرء قدر ما کان یحسنه — فاطلب لنفسک ما تعلو به وصل

آدمی کی قیمت اس کا عمل نیک ہے — پس اپنی ذات کے لئے اس بات کے طالب ہو جو اس کے لئے باعث رفعت ہو

۱۱۔ انّ ھذه القلوب تملّ — بیشک جس طرح جسم تھک جاتے ہیں، اسی

کما تملّ الابدان، فابتغوا — اسی طرح دل بھی تھک جاتے ہیں،

لها طرائف الحِکَم[2] — پس اُن کیلئے تازہ و ظریف حکمتیں تلاش کرو

ابو الفتح البستی متوفی سنہ ۴۰۰ھ نے یہ مضمون اس طرح نظم کیا ہے[3]

افد طبعک المکدود بالجد راحة — یجمّ وعلّله بشیء من المزح

ولکن اذا اعطیته ذاک فلیکن — بمقدار ما یعطی الطعام من الملح

ترجمہ (اپنی جفاکش طبیعت کو زیادہ تر جد و جہد کا خوگر بنا کر راحت بخشو، مگر کبھی کبھی اس کو بہلانے کے لئے لطف و تفریح کی باتیں بھی کر لو، لیکن مذاق و تفریح کی بس ایک حد ہونی چاہیئے، جس طرح کھانے میں نمک کی مقدار ہوتی ہے۔

۱۲۔ الحزم سوء الظن۔ — احتیاط بدگمانی ہے۔

کسی شاعر نے ان ہی الفاظ کے ساتھ یہ مضمون اس طرح نظم کیا ہے[4]

[1] جواہر الادب (۲: ۴۳۲) [2] نہج (۳: ۱۶۰، رقم ۹۱ و ۱۹۷، رقم ۱۹۷)

[3] زہر الآداب (۴: ۲۰۲) [4] شرح ابن ابی الحدید (۱۸: ۲۷۸)

أسأت اذا احسنت ظنی بکمْ والحزم سوء الظن بالناسِ

میں نے غلطی کی کہ تمہارے بارے میں حسن ظن کیا، کیونکہ احتیاط اس میں ہے کہ لوگوں کے ساتھ بدگمان رہا جائے۔

۱۳) مثل الدنیا کمثل الحیّۃِ — دنیا کی مثال ایک سانپ کی ہے،

لین مسّہا، والسّم القاتل فی — جو چھونے میں نہایت نرم ہے لیکن

جوفہا[۱] — اس کے پیٹ میں زہر قاتل بھرا ہوا ہے۔

یہ مضمون عربی کے مشہور شاعر ابوالعتاہیہ نے اس طرح نظم کیا ہے[۲]

انّما الدّھر ارقم لین المسّ — وفی نابہ السقام العقام

بیشک دنیا ایک ایسا سانپ ہے جو چھونے میں نہایت نرم ہے لیکن اس کے دانت میں لاعلاج بیماریاں بھری ہوئی ہیں۔

۱۴) المرء مخبوء تحت لسانہ[۳] — انسان اپنی زبان کے نیچے چھپا ہوا ہے۔

احنف بن قیس متوفی ۷۲ھ نے قریب قریب یہی مضمون کچھ اضافے کے ساتھ اس طرح نظم کیا ہے[۴]

وکائن تری من صامت لک معجب — زیادتہ أو نقصہ فی التکلّم

لسان الفتی نصف ونصف فؤادہ — فلم یبق الّا صورۃ اللّحم والدّم

[۱] نہج (۳ : ۱۶۸ ، ۱۱۹)، رقم ۱۱۹ [۲] شرح ابن ابی الحدید (۱۸ : ۲۸۴) [۳] نہج (۳ : ۱۸۹ ، ۱۴۰) [۴] شرح المعلقات السبع (زوزنی) : ۹۴،

(بہت سے خاموش لوگ تم کو بھلے لگتے ہیں، حالانکہ ان کی کمی اور زیادتی بولنے ہی میں ہوتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ نصف مرد کی زبان ہے، اور نصف اس کا دل، اس کے بعد سوائے گوشت اور خون کے کچھ باقی نہیں رہتا)

یہ اشعار زہیر بن ابی سلمٰی المزنی کی طرف بھی منسوب ہیں[۱]

۱۵) من استقبل وجوہ الآراء — جو شخص رایوں کے مختلف پہلوؤں

عرف مواقع الخطاء[۲] — کا خیر مقدم کرتا ہے، اسے غلطی کے مقامات معلوم ہوجاتے ہیں۔

قطامی کا شعر ہے[۳]

وخیر الرّای ما استقبلت منہ — ولیس بان تتبّعہ اتباعا

اچھی رائے وہ ہے جس پر تو خود غور کرے، نہ یہ کہ تو پورا پورا اس کا اتباع کرے۔

۱۶) النّاس اعداء ما جھلوا[۴] — لوگ اس چیز کے دشمن ہوتے ہیں، جس کو وہ نہیں جانتے۔

ایک شاعر نے اس مضمون کو اس طرح نظم کیا ہے[۵]

جھلت امرا، فابدیت النکیر لہ — والجاھلون لاھل العلم اعداء

جس بات سے میں ناواقف رہا، اس کو برا سمجھا سچ ہے کہ جاہل لوگ اہل علم کے دشمن ہوتے ہی ہیں۔

(باقی)

[۱] شرح العیون : ۱۱۲ [۲] نہج (۳ : ۱۹۳)، رقم ۱۷۳ [۳] دیوان القطامی : ۱۳۵ [۴] نہج (۳ : ۱۹۳)، رقم ۱۷۲ و ۲۵۸، رقم ۴۳۸ [۵] شرح ابن ابی الحدید (۲۰ : ۸۶)

ابو سلیمان الدارانی

از

محمد نعیم صدیقی ندوی ایم ، اے (علیگ)

اتباع تابعین کے زمرہ میں جہاں اقلیم علم وفن کے بہت سے تاجدار شامل تھے ، وہیں بکثرت ایسے صاحب کمال بزرگ بھی تھے جو علمی اعتبار سے خواہ زیادہ بلند مرتبہ نہ ہوں لیکن زہد و اتقاء ، رشد و ہدایت اور بلند روحانی مدارج میں غیر معمولی حیثیت کے مالک تھے ، عمل صالح ان کی شخصیت کا زیور اور عبادت و ریاضت ان کا طغرائے امتیاز تھا ، ابو سلیمان الدارانی کا شمار ایسے ہی صلحائے امت میں کیا جاتا ہے ، وہ یقیناً علم و فضل میں بھی مرتبہ بلند اور مقام عالی رکھتے تھے لیکن اس سے کہیں زیادہ وہ ایک عظیم المرتبت صوفی ، شیخ طریقت اور بزرگ دین کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں ، ان کا سینہ شریعت و طریقت کا مجمع البحرین تھا ، انھوں نے اپنی تعلیم و تربیت اور تزکیہ و ہدایت سے ایک عالم کو مستفید کیا ، ابن عماد حنبلی نے لکھا ہے کہ وہ ان اکابر اولیاء میں تھے جو اپنے روحانی کمالات کے اعتبار سے ارباب کشف و شہود خیال کیے جاتے ہیں ،[1]

ان کا اصل نام عبد الرحمن تھا لیکن اپنی کنیت ابو سلیمان سے شہرت پائی ، والد کا نام گرامی احمد اور دادا کا عطیہ تھا ،[2] اصلاً واسط کے رہنے والے تھے ، مگر داریا میں مستقل سکونت اختیا

[1] شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۳ [2] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۴۸ ،

کر لی تھی ، جو غوطہ (دمشق) کے مغرب میں ایک گاؤں کا نام ہے ، غوطہ دمشق کا حسین ترین خطہ شمار ہوتا ہے ، بعض سیاحوں نے اس کو جنت ارضی سے تعبیر کیا ہے ، وہاں نوع بنوع قدرتی مناظر ، میووں اور پھلوں سے لدے باغات ، بل کھاتی نہریں اور سرسبزی و شادابی قدم قدم پر دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے ، اسی اہمیت کے باعث اس خطہ کے طبعی اور جغرافیائی حالات پر ڈاکٹر صفوح نے غوطہ دمشق کے نام سے ایک مستقل ضخیم کتاب تالیف کی ہے ، جس کے آغاز کی درج ذیل چند سطور میں گویا پوری کتاب کا حاصل آگیا ہے ،

اجمع الباحثون علی أن غوطة	محققین کا اتفاق ہے کہ غوطہ دمشق
دمشق کلها نزهة وعدّها	مکمل شادابی ہے ، اس کو اس کی
جنة الأرض لنضارتها	سرسبزی ، کثرت باغات اور چشموں
وکثرة میاهها وبساتینها	اور پانی کی زیادتی کے باعث جنت
وحدائقها . فإذا صعدت	ارضی شمار کیا جاتا ہے ، آپ اگر کسی
علی مرتفع تری الأشجار و	بلندی پر چڑھ کر نظارہ کریں تو آپ کو
البساتین تحیط بالمدینة	درخت اور باغات چاند کے ہالہ کی
من کل جانب إحاطة الهالة	طرح شہر کا احاطہ کیے دکھائی پڑیں
بالقمر ، وإذا خرجت من	گے اور جب آپ شہر سے نکلیں گے
المدینة لا تری إلا	تو آپ کو گھنے باغات ، رواں دواں
حدائق غناء ومیاها	پانی اور اونچے اونچے درخت اور حسین
جاریة وأشجارا نامیة	و سرسبز کھیتیاں نظر آئیں گی ۔
وحقولا جمیلة خضرا ء[1]	

[1] غوطہ دمشق ص ۱۵

ابو سلیمان الدارانی کا مسکن دمشق کے اسی جنت نظر خطہ میں واقع تھا۔ یاقوت رومی اور علامہ سمعانی دونوں اس کے بارے میں رقمطراز ہیں،

ھی قریۃ کبیرۃ حسنۃ من	یہ غوطہ دمشق کا ایک خوبصورت
قری غوطۃ دمشق[1]	اور بڑا گاؤں ہے۔

اسکی طرف جدید و قدیم علماء اور محدثین کی ایک بڑی جماعت منسوب ہے[2] جن میں درج ذیل چار شخصیتوں کے نام نہایت ممتاز ہیں، (۱) مشہور عالم ابو عتبہ عبد الرحمٰن الازدی جو امام مکحول شامی کے شاگرد، عبد اللہ بن مبارک کے استاذ اور فقہائے شام کے طبقہ دوم میں شمار ہوتے ہیں۔ (۲) نامور تابعی ابو بکر سلیمان بن حبیب، جو اپنی فقہی مہارت کے باعث دمشق میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، یزید بن عبد الملک اور ہشام بن عبد الملک کی جانب سے قاضی تھے، تیس[3] سال تک نہایت شان و شوکت، کمال حق گوئی اور عدل گستری کے ساتھ منصب قضا کے فرائض انجام دیئے، ان کے شیوخ حدیث میں حضرت انس بن مالک، حضرت ابو ہریرہؓ اور امیر معاویہؓ کے نام لائق ذکر ہیں، خود ان کے فیضان علم سے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، مروین سنان اور عثمان بن ابی العاتکہ جیسے نادرۂ روزگار علماء مستفید ہوئے[4]

حضرت ابو سلیمان الدارانی بھی اسی معدن فضل و کمال کے ایک لعل گرانمایہ تھے[5] بلکہ داریا کی طرف منسوب اہل علم میں سب سے زیادہ شہرت و عظمت ان ہی کے نصیب میں آئی۔ ان کا خاندانی تعلق بنو عنس سے تھا،[6] جو یمن کے مشہور قبیلہ مذحج کی ایک شاخ ہے،

---

[1] معجم البلدان ج ۲ ص ۲۲ و کتاب الانساب جدید اڈیشن حیدرآباد ج ۵ ص ۲۱۱ [2] اللباب فی تہذیب الانساب ج ۱ ص ۳۰ [3] معجم البلدان ج ۲ ص ۲۲ [4] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۲۹۵۔

جن کے جد امجد عنس بن مالک تھے، اس خاندان میں ممتاز اہل علم فضلائے روزگار، اور کبار عباد و زہاد کثرت سے ہوئے ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں،

(۱) ابو عبد الرحمٰن عنسی یہ شام کے ایک بڑے عابد و زاہد بزرگ تھے، ان کے بارے میں مشہور تھا، کہ خدا ان کی قسم کو ہمیشہ پوری کرتا تھا، (۲) جلیل المرتبت تابعی حضرت عمر بن ہانی عنسی انھوں نے تیس صحابہ کرام کے دیدار سے اپنی چشم عقیدت کو روشن کیا تھا۔ ان کے دامن فیض سے جن لوگوں نے استفادہ کیا ان میں امام اوزاعی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، (۳) اسماعیل بن عیاش عنسی بھی اسی معدن علم کے گوہر شب چراغ تھے،[1] انکے بارے میں ابو زرعہ کا قول ہے کہ شام میں امام اوزاعی کے بعد اسماعیل بن عیاش کے مثل کوئی نہ تھا،[2] ہزاروں حدیثیں ان کو ازبر تھیں، ارباب تذکرہ ان کی ذہانت، فطانت اور حیرت انگیز قوت حافظہ پر متفق اللسان ہیں۔ بقول امام احمد ان کے دماغ کے خزانہ میں تیس ہزار حدیثیں محفوظ تھیں۔[3]

علمی فضل و کمال

حضرت ابو سلیمان نے حدیث کا علم عراق کے نامور محدثین سے حاصل کیا تھا اور انھیں حضرت سفیان ثوری اور ربیع بن صبیح جیسے منتخب روزگار علمائے حدیث سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ امام ثوری کی شخصیت زمرۂ تبع تابعین کا گل سرسبد تھی، وہ علم و فضل اور سیرت و کردار دونوں اعتبار سے نہایت بلند پایہ تھے، اس کا کچھ اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ امام ابو حنیفہ انھیں اپنے استاذ ابراہیم نخعی پر بھی باین ہمہ علوئے مرتبت و جلالت شان، فوقیت دیتے تھے،[4] اور امام مالک فرمایا کرتے تھے کہ عراق ہم پر

---

[1] کتاب الانساب ج ۹ ص ۱۰۴ قدیم اڈیشن، [2] میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۱۳ [3] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۲۲ [4] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۶۹

درہم و دینار کی بارش کیا کرتا تھا، مگر سفیان کے بعد اس نے علم کی بارش شروع کر دی[1]،

اسی طرح شیخ دارانی کے دوسرے قابل ذکر استاذ ربیع بن صبیح، بھی علم و عمل میں یگانۂ

عہد تھے، ان کا شمار حضرت حسن بصری کے ارشد تلامذہ میں ہوتا ہے، علاوہ ازیں انہوں

نے حضرت محمد ابن سیرین محمد بن جبیر اور عطا، بن ابی رباح وغیرہ کے آفتاب کمال سے

بھی اکتساب فیض کیا تھا، امام شعبہ کا قول ہے۔

ان فی الربیع خصالا لا تکون	بلاشبہ ربیع بہت سی ایسی خوبیوں
فی الرجل واحد منہا[2]	کے حامل میں جن میں سے کوئی ایک بھی
	دوسرے میں نہیں پائی جاتی۔

ان کی عدالت و ثقاہت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ جرح و تعدیل کے مشہور

امام عبد الرحمن بن مہدی بھی ان سے روایت کرتے ہیں[3]

خود شیخ دارانی کے خرمن علم سے خوشہ چینی کرنے والوں میں احمد بن ابی الحواری

اور قاسم بن عثمان الجوعی وغیرہ کے نام ملتے ہیں، اول الذکر کو ان سے تلمذ خاص حاصل تھا،

چونکہ ابو سلیمان کے زہد و ورع اور عبادت و ریاضت میں فنا ہو جانے کے باعث انکے

علمی کمالات پس پشت پڑ گئے تھے، اس لئے اہل طبقات نے ان کی علمی حیثیت نمایاں

کرنے کے بجائے ان کے سلوک و طریقت کے واقعات قلمبند کئے ہیں، صرف محدث ابن

جوزی نے اتنا مزید اضافہ کیا ہے کہ ابو سلیمان کے واسطہ سے مروی تین مسند حدیثیں

مجھ تک پہونچی ہیں، جن میں سے پہلی حدیث بروایت حضرت انسؓ یہ ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

[1] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۶۹ [2] میزان الاعتدال ج ۱ ص ۳۳۲ [3] ایضاً

من صلی قبل الظہر اربعاً	ارشاد فرمایا جس شخص نے ظہر سے
غفر لہ ذنوبہ یومہ ذلک	پہلے چار رکعتیں پڑھیں اس کے اس
	دن کے گناہ معاف کر دیے گئے۔

دوسری حدیث حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے یہ ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ	رسول اکرم کا ارشاد ہے کہ جو شخص
وسلم من تواضع للہ رافعہ اللہ	تواضع اختیار کرے گا، اللہ اس کے
	مراتب بلند فرما دیں گے۔

تیسری حدیث بہت طویل ہے اس میں ایک شامی وفد کو حضور اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم نے بیش قیمت نصائح اور ہدایات سے نوازا ہے[1]

اصلاح و تزکیہ۔ ان کے صحیفۂ زندگی کا زیادہ درخشاں باب سلوک و تصوف سے متعلق

ہے بقول حافظ ذہبی وہ روحانیت و معرفت کے بحر ناپید اکنار کے ایک کامیاب شناور

تھے[2]۔ اسی وجہ سے اہل سیر نے ان کے اس روشن پہلو کو بہت ہی شاندار الفاظ میں اجاگر کیا

ہے، چنانچہ ابن خلکان رقمطراز ہیں۔

احد رجال الطریقۃ کان	وہ اہل طریقت میں تھے، ان کا
من جملۃ السادات وارباب	شمار بہت سے اہل سادات اور
الجد فی المجاہدات[3]	کثرت سے مجاہدہ کرنے والوں میں تھا

علامہ ذہبی لکھتے ہیں۔

[1] صفوۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۱۰۳ [2] میزان الاعتدال ج ۱ ص [3] تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۹۵

الزاهد القدوة احد الابدال[1]	وہ بہت بڑے زاہد اور ابدال میں سے تھے،

سمعانی نے لکھا ہے۔

كان من افاضل اهل زمانه وعبادهم وخيار اهل الشام وزهادهم[2]	وہ اپنے زمانہ کے ایک بڑے فاضل اور عبادت گزار، اور شام کے بہترین لوگوں اور زاہدوں میں تھے،

ابن عماد الحنبلی فرماتے ہیں کہ زہد و صلاح میں ان کی نظیر نہیں ملتی[3] خطیب بغدادی نے اپنی مشہور تاریخ میں انھیں أحد عباد الله الصالحين ومن الزهاد المتعبدين لکھکر خراج عقیدت پیش کیا ہے[4]

صحت عقیدہ | عقائد کی صفائی اور صحت کے معاملہ میں وہ نہایت متشدد تھے، ابو جعفر محمد بن احمد الموصلی بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنہ ۲۰۳ھ میں ابو سلیمان الدارانی کو بغداد میں دیکھا، انکی ڈاڑھی میں خضاب لگا ہوا تھا، وہ مسجد عبد الوہاب الخفاف میں مقیم تھے، ایک دن کسی نے عرض کیا، حضرت عبد الوہاب الخفاف تو قدریہ کے عقائد رکھتے تھے، یہ معلوم ہوتے ہی شیخ دارانی نے اس میں نماز پڑھنا چھوڑ دیا، اور دوسری مسجد میں چلے گئے[5]

اقوال زریں | ابو سلیمان الدارانی نے اپنے حکمت و بصیرت سے پرُ فرمودات میں حقائق ایمانی، دقائق احسانی، اور اسرار حکمت ربانی کو برملا فاش کیا ہے، ان تمام اقوال کے راوی شیخ کے تلمیذ رشید اور مسترشد خاص ابن ابی الحواری ہیں، اگر استقصاء کر کے تمام ملفوظات کو

---

[1] العبر فی خبر من غبر ج ۱ ص ۳۴۲۔ [2] کتاب الانساب جلد ۵ ایڈیشن حیدرآباد ج ۵ ص ۲۰۱ [3] شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۳ [4] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۴۸ [5] ایضاً ص ۲۴۹

یکجا کیا جائے تو ایک مستقل دفتر تیار ہو جائے۔ محدث ابن جوزی نے صفۃ الصفوۃ، حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ، خطیب نے تاریخ بغداد اور شیخ فرید الدین عطار نے تذکرۃ الاولیاء میں بہت بسط و تفصیل کے ساتھ ان کے ملفوظات نقل کئے ہیں، ذیل میں چند بصیرت آموز اقوال درج کئے جاتے ہیں۔

ایک موقع پر فرمایا کہ "بہترین عمل خواہشات نفسانی کی مخالفت کرنا ہے، اولاد، دولت اور گھر بار میں سے جو چیز تم کو خدا کی یاد سے غافل کر دے وہ نحوست کا باعث ہے[1]"

فرمایا "میں رات محراب میں دعا کرنے میں مصروف تھا، میرے دونوں ہاتھ خدا کے حضور میں پھیلے ہوئے تھے، اسی اثناء میں مجھے ٹھنڈک زیادہ معلوم ہوئی تو میں نے ایک ہاتھ سمیٹ لیا۔ پھر نیند کا غلبہ ہوا، اور میں اسی طرح سو گیا اتنے میں ایک ہاتف غیبی نے آواز دی اے ابو سلیمان! ہم نے پھیلے ہوئے ہاتھ میں وہ سب کچھ رکھ دیا، جو تمہیں مطلوب تھا، اور اگر تم دوسرا ہاتھ بھی اسی طرح پھیلائے رکھتے تو اسے بھی بھر دیتے" ابو سلیمان فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد میں نے قسم کھائی تھی کہ خواہ کیسی ہی گرمی یا سردی ہو دعا کے وقت دونوں ہاتھ پھیلائے رکھونگا!

احمد بن ابی الحواری بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے استاذ کی زبان سے بارہا یہ ارشاد سنا کہ دنیا و آخرت میں ہر خیر و نیکی کی جڑ اللہ جل شانہ کی خشیت اور اس کا خوف ہے۔ یاد رکھو دنیا کی کنجی یہ ہے کہ انسان شکم سیر ہو کر زندگی گذارے۔ اور آخرت کی کنجی بھوکا رہنا ہے[2]

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۵۷ [2] صفۃ الصفوۃ ج ۴ آخری مقولہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان آخرت میں کامیابی چاہے تو اسکو مزخرفات دنیا میں نہ پڑنا چاہئے، فقر و فاقہ کے عالم میں خشیت و انابت الی اللہ کا غلبہ ہوتا ہے اور فراغت و خوش حالی خدا سے غافل کر دیتی ہے۔

ان ہی سے روایت ہے کہ ایک دن حضرت ابوسلیمان الدارانی کو گرم گرم روٹی نمک سے کھانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ میں نے ان کو لاکر دی۔ شیخ نے اس میں سے تھوڑا سا ٹکڑا توڑا، اور پھر پوری روٹی پھینک دی اس کے بعد زاروقطار رونے لگے۔ اور کہتے جاتے ؎۔

یارب عجلت لی شہوتی　　خداوندا میری خواہش نفسانی نے
لقد اطلت جہدی وشقوتی　　مجھے مغلوب کر لیا۔ میں صدق دل سے
وانا تائب۔　　اپنی اس لغزش کی توبہ کرتا ہوں۔

راوی کا بیان ہے کہ پھر تاحیات انھوں نے نمک نہیں چکھا[1]

فرمایا: "بیشبہ چور کسی ویران مکان میں نقب زنی کرنے نہیں جاتا، حالانکہ وہ اس میں جہاں چاہے جاسکتا ہے، وہ صرف ایسے گھر کا قصد کرتا ہے جو مال و زر سے معمور ہو بعینہ یہی حال ابلیس لعین کا ہے، وہ ان ہی قلوب پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو خشیت الٰہی و انابت الی اللہ، اور ذکر و فکر سے معمور رہتے ہیں"۔

فرمایا "اللہ کے کچھ برگزیدہ بندے ایسے ہوتے ہیں جن کے لئے جنت کی نوع بنوع نعمتوں میں بھی کوئی ایسی کشش نہیں ہوتی جو انھیں یاد الٰہی سے غافل کر دے۔ دنیا کی حقیقت اللہ کے نزدیک پرکاہ کے برابر بھی نہیں، اس لئے اس میں زہد و تقا کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ ہاں جنت میں رہ کر اور حور و غلمان کی موجودگی میں خدا کے سوا اس کے دل میں کسی کے لیے جگہ نہ ہو تو وہی اصل زاہد و متقی ہے"۔

فرمایا کہ لوگ زیادہ سے زیادہ مال جمع کر کے اہل ثروت بننا چاہتے ہیں، حالانکہ

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص [illegible]

ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے (کہ دولت کثرت مال کا نام ہے) خوب سمجھ لو کہ اصل غنی (سرمایہ دار) وہ ہے جو قناعت کی دولت رکھتا ہو، اسی طرح راحت خوش حالی میں نہیں بلکہ تنگی میں ہے، لوگ عام طور پر نرم اور باریک لباس، عمدہ غذا اور آرام دہ مکان میں آسائش تلاش کرتے ہیں، حالانکہ فی الاصل اسلام، ایمان، عمل صالح اور ذکر اللہ میں پوشیدہ ہے،

فرمایا کہ قیامت کے دن خدائے رحمان کی ہم نشینی کا شرف ان لوگوں کو حاصل ہوگا جو کرم، حلم، علم، حکمت، نرم خوئی، رحمدلی، عفو و درگذر، احسان، نیکی، لطف و مروت اور رأفت و محبت کی صفات سے متصف ہوں گے[1]

ابن ابی الحواری کہتے ہیں کہ میرے شیخ برابر فرمایا کرتے تھے،

إن النفس اذا جاعت وعطشت　　جب نفس بھوکا پیاسا ہوتا ہے تو
صفا القلب ورق. واذا شبعت　　دل میں صفائی اور نرمی پیدا ہوتی
عمی القلب[2]　　ہے، اور شکم سیری کی حالت میں قلب
　　اندھا ہوجاتا ہے۔

فرمایا جس شخص نے استغنا کے ساتھ اور حلال ذریعہ سے دنیا کو طلب کیا تو وہ قیامت کے روز خدا سے اس عالم میں ملے گا کہ اس کا چہرہ چودہویں رات کے چاند کے مانند درخشاں ہوگا۔[3]

فرمایا: "ہر خیر کا ایک زیور ہوتا ہے۔ صدق کی آرائش خشوع ہے، تواضع کا مطلب

---

[1] تذکرۃ الاولیا، عطار، ج ۲ ص ۲۳۳ [2] صفۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۱۰۲

[3] البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۵۸

یہ ہے کہ انسان اپنے عمل میں کبر و غرور سے محفوظ رہے، دنیا میں غور و فکر آخرت کا حجاب ہے اور آخرت کے بارے میں تفکر دلوں کی زندگی اور ثمرہ حکمت ہے۔ آنکھوں کو رونے اور دل کو آخرت کے بارے میں فکر کرنے کا عادی بنالو۔[1]

فرمایا۔ جو شخص دن میں کوئی نیک عمل کرتا ہے، رات میں اس کی غیبی حفاظت کی جاتی ہے، اور جو رات کو نیکی کرتا ہے، اس کی دن بھر حفاظت ہوتی ہے۔ بہترین سخاوت وہ ہے، جو ضرورت کے مطابق ہو۔ جو شخص اپنی جان کو قیمتی جانے وہ ہرگز خدمت کی حلاوت نہیں پاسکتا۔[2]

کشف و کرامات حضرت ابوسلیمان الدارانی کی کرامات بھی کثرت سے منقول ہیں۔

ابو عبد الرحمٰن السلمی نے اپنی کتاب محن المشائخ میں لکھا ہے کہ ایک بار شیخ دارانی کسی بات پر اہل دمشق سے ناراض ہوکر وہاں سے کسی سرحدی مقام پر چلے گئے، ان کے جانے کے بعد کسی شخص نے عالم خواب میں دیکھا کہ اگر شیخ دارانی دمشق واپس نہیں آئیں گے تو تمام اہل وطن تباہ و برباد ہوجائیں گے۔ چنانچہ عوام کا ایک جم غفیر ان کی تلاش میں نکلا اور انکے پاس پہونچکر نہایت عجز و تذلل کے ساتھ واپسی کی درخواست کی یہاں تک کہ شیخ پھر دمشق واپس آگئے۔[3]

وفات باختلاف روایت سنہ ۲۰۴ھ، ۲۰۵ھ، ۲۱۵ھ اور ۲۳۵ھ میں علم و عمل کا یہ نیر تاباں غروب ہوگیا۔[4] ابن جوزی نے ان سنین وفات میں اول الذکر ہی کو ارجح قرار دیا ہے۔[5] اور ابن عماد حنبلی، علامہ ذہبی، ابن خلکان اور خطیب بغدادی

[1] تذکرۃ الاولیاء عطار ج ۲ ص ۲۳۳ [2] ایضاً ص ۲۳۵ [3] البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۵۰ [4] ایضاً ص ۲۵۹ [5] صفۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۲۰۸

بھی اس کی توثیق کی ہے۔[1]

ان کے انتقال کی خبر سن کر مروان الطاطری نے کہا۔

لقد اصیب بہ اھل الاسلام کلھم۔[2] ان کی وفات سے تمام مسلمانوں کو شدید رنج و غم ہوا۔

قریہ داریا میں تدفین ہوئی، اور وہاں انکا مزار آج بھی مرجع انام ہے، حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ان کے مزار کی عمارت بہت شاندار ہے، امیر ناصح الدین عمر النہروانی نے مزار کے ساتھ ایک مسجد بھی تعمیر کرائی، مزید برآں اس میں قیام کرنے والوں کے مصارف کے لئے کچھ زمین بھی وقف کی، جس کی پیداوار اور آمدنی مسجد پر صرف ہوتی ہے۔[3]

ان کی اولاد میں شیخ سلیمان کا تذکرہ نویسوں نے ذکر کیا ہے وہ بھی اپنے وقت کے مشہور عابد و زاہد تھے، اپنے والد کی طرح انھوں نے بھی ہدایت و ارشاد کی مجلس آراستہ کی تھی، جس میں شریک ہوکر بکثرت تشنگان معرفت سیراب ہوتے تھے، ان کے حقیقت افروز اقوال بھی ابوسلیمان ہی کے مذکورۃ الصدر ملفوظات کے رنگ کے ہوتے تھے۔ اپنے والد کی وفات کے دو سال ایک ماہ بعد ۲۳۶ھ میں رحلت فرمائی۔[4]

[1] شذرات ج ۲ ص ۱۳، العبر ج ۱ ص ۳۴۴، ابن خلکان ج ۱ ص ۴۹۵، تاریخ بغداد ج ۱۰ [2] البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۵۹ [3] ایضاً [4] معجم البلدان ج ۴ ص ۲۲۔

حکیم ناطق لکھنوی

شخصیت و شاعری

از

جناب ہارون الرشید صاحب ڈھاکہ بنگلہ دیش

حکیم ناطق لکھنوی ایک باکمال شاعر اور اچھے نثرنگار تھے، اُن کا پورا نام سید ابو العلا سعید احمد تھا۔ ۱۸۷۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے، اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔

۱۸۹۶ء میں جب کہ اُن کی عمر صرف اٹھارہ سال کی تھی، کان پور سے نکلنے والے اخبار "نورالانوار" کے اڈیٹر مقرر ہوئے، تقریباً پانچ سال تک وہ اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ کان پور کے قیام کے زمانہ میں انھوں نے عبداللہ علم صاحب کی فرمایش پر ناول اور تاریخی کتابیں تصنیف کیں، انھیں اس کے لئے تین سو روپیہ ماہانہ ملتے تھے، چالیس پچاس کتابیں اسی دور میں شائع ہو گئیں، اس کے بعد حیدرآباد دکن کے سرکاری اخبار ملک و ملت کے شعبۂ ادارت سے وابستہ ہوئے، قیام حیدرآباد کے دوران انھوں نے مختلف علوم و فنون کی تحصیل کے ساتھ حکیم مصباح الدین خاں سے طب کی تعلیم بھی شروع کی، پھر دہلی جاکر اس کی تکمیل حکیم عبدالمجید خاں سے کی، اس کے بعد انھوں نے خود طبابت شروع کر دی، اور آخیر وقت تک یہی ان کا ذریعۂ معاش رہا، کچھ دنوں کان پور اور لکھنؤ میں طبابت کرتے رہے۔ ۱۹۳۴ء میں ایک صاحب کے علاج

کی غرض سے کلکتہ گئے، اور وہیں قیام پذیر ہو گئے۔ تقسیم کے بعد ۱۹۵۰ء میں چاٹگام آئے، لیکن تین مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ وفات پائی۔ اُن کی قبر چاٹگام ہی میں ہے۔

حکیم ناطق لکھنوی یوں تو مختلف علوم و فنون مثلاً فلسفہ و منطق، عربی و فارسی ادب، فقہ، علم ہیئت، طب، علم نجوم، علم جفر، اور خوش نویسی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے، مگر شاعر کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں، اس کے علاوہ انھوں نے بہت سے تنقیدی مضامین اور مختلف علوم پر کتابیں بھی لکھیں، ان کی کتاب "شجرۂ مشاہیر" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے تصوف پر بھی کتابیں "اسرارِ حقیقت" "بستانِ معرفت" وغیرہ لکھیں، اُن کی تین اہم کتابیں "تذکرۂ شعرائے اردو" "وید اور ویدانت" اور "فارسی شاعری کی ابتدا اور انتہا" اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔

حکیم ناطق کی سیرت و کردار کے بارے میں پروفیسر اقبال عظیم لکھتے ہیں:۔

"حکیم صاحب دیر آشنا، کم آمیز اور سریع الغیظ تھے، صاف گو اس درجہ کہ کسی کو بخشنا نہ جانتے تھے، اور مزاج اتنا نازک پایا تھا، کہ ہر کس و ناکس کو اُن سے گفتگو کی مجال نہ تھی، اُن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس مزاج کے ساتھ دنیا میں اس کا کہیں ٹھکانا نہ ہوتا، لیکن مجبوری یہ تھی کہ اُن کے کمال کو جھٹلانا اور انھیں نظر انداز کرنا کسی کے بس کی بات نہ تھی، چنانچہ وہ جہاں بھی رہے، اور جس حال میں رہے، ماحول پر اُن کا تسلط رہا، اور اُن کے ماننے والوں کے حلقے میں اضافہ ہوتا رہا، لیکن حکیم صاحب کے انتہائی پریشانی کے زمانے میں بھی کسی کا احسان گوارا نہ ہوا، انھیں اپنے دست و بازو پر اعتماد تھا، اور جفاکشی اُن کا شعار تھا، عام طور پر دنیا انھیں کج خلق اور مغرور کہتی تھی لیکن جن لوگوں سے اُن کے مراسم تھے، وہ آج تک انھیں یاد کرکے روتے ہیں، ان کی جیسی آن بان اور وقار کا انسان دور تک مشکل ہی سے ملے گا" (مشرقی بنگال میں اردو ص: ۱۲۱-۱۲۲)

حکیم ناطق نصف صدی سے زیادہ عرصے تک شعر کہتے رہے، لیکن انھیں اپنا کلام جمع کرنے اور شائع کرانے کا کوئی خاص شوق نہ تھا، ابتدا میں اپنی غزلیں اکثر بیچ دیا کرتے تھے، یہاں تک کہ ایک یا دو بار پورا دیوان معاوضہ لے کر دے دیا۔ "دیوان ناطق" کے مقدمے میں خود لکھتے ہیں:۔

"کانپور میں چار پانچ سال کے اندر اتنی غزلیں کہہ لی تھیں کہ ایک دیوان تیار ہو گیا، وہ میں نے بیچ ڈالا، کیونکہ مجھے تو پسند نہ تھا، مگر خریدار کو پسند آیا۔"[1]

"لوگوں نے غزلیں مجھ سے خریدی ہیں، اور ایک شخص نے کافی معاوضہ دے کر پورا ایک دیوان کہلوایا، جو خریدار کے نام سے مقبول بھی ہو گیا۔"[2]

یہی وجہ ہے کہ نصف صدی کی شعر گوئی اور بسیار گوئی کے باوجود اُن کا دیوان بہت مختصر ہے۔ انھیں ہر صنفِ سخن پر قدرت حاصل تھی، اُن کے دیوان میں غزل، قصیدہ، رُباعی، مرثیہ، مثنوی، غرض تمام اصنافِ سخن موجود ہیں۔ اُن کی ایک قابلِ قدر تصنیف "نظمِ اُردو" ہے جس میں زبانِ اُردو کی منظوم تاریخ پیش کی گئی ہے لیکن تمام اصنافِ سخن پر قدرت رکھنے کے باوجود ناطق دراصل غزل کے شاعر تھے، انھوں نے اپنے دیوان کا جو مقدمہ لکھا ہے، وہ ایک اہم اور یادگار چیز ہے۔ اس مقدمہ میں انھوں نے شعر و شاعری کی حقیقت، اپنا نظریۂ شعر اور اپنی شاعری کی روداد پیش کی ہے، یہ مقدمہ بہت دلچسپ ہے، اور اس میں بہت سی باتیں پہلی بار وضاحت سے منظرِ عام پر آئی ہیں، مثلاً دورِ جدید میں لکھنوی غزل گوئی کی اصلاح کس طرح ہوئی، اس کی روداد ملاحظہ ہو:۔

"۱۹۰۵ء میں لکھنؤ کے چند نوجوان شعرا اور ذوقِ ادب رکھنے والوں نے مہذب شاعری کی بنا ڈالی، اور عملاً بہت سے الفاظ و خیالات کو ترک کیا، اسی لیے

۱؎ دیوانِ ناطق - ص ۵۹۔ ۲؎ دیوانِ ناطق ص ۶۲۔

خاکسار نے مضامین لکھے اور غیر مہذب کلام پر اعتراض کیے، جو "زندہ دل" اخبار و رسالہ "پیام یار" میں شائع ہوئے اور تنقید و تقابل ہم طرح غزلوں کا شروع کیا، بعض مضامین "خدنگ نظر" میں بھی شائع ہوئے، رفتہ رفتہ سات شعرا ہم خیال اور ہم نوا ہو گئے، جو کہ سبعۂ سیارہ کے نام سے مشہور ہوئے، اعلیٰ محسن خاں عرف ننھے آغا آبر، نوبت رائے نظر، منشی مرزا شرر، مولانا آصفی، مرزا محمد ہادی عزیز، کاظم حسین محشر، اور یہ ہیچمداں، اس شاعری میں خیالاتِ ذیل ہمیشہ کے لئے رخصت کر دیئے گئے، مثلاً پیغمبروں کی تنقیص، زیادہ اور بے کیف مبالغہ، نقطۂ دہن، اور موئے کمر کی معدومیت، بوسہ، وصلِ رقیب کی کامیابی، اور اپنی ناکامی، عورتوں کے سینے وغیرہ کی تعریف، محبوب کو صنم اور دلبر کے خطاب سے مخاطب کرنا، بہت کہنہ تشبیہیں جیسے مارِ زلف، صراحی دارِ گردن، چاہِ ذقن، عنابِ لب، دزدِ حنا، اپنی لاغری یہاں تک کہ کہیں نظر نہیں آتے، جن الفاظ میں فحش کے پہلو غالب ہوں، وہ یک قلم ترک کر دیئے گئے، جیسے سرفراز کرنا، بکلی ہونا، خوشتیاں، ناہوار وغیرہ، عورتوں کے لئے جو محاورے مخصوص ہیں، یا جو بول چال بازاری عوام کی ہے، اُن سے پرہیز کیا گیا، ان باتوں کے علاوہ مفرد الفاظ میں جو حروف زائد ہیں، وہ خارج کئے گئے، جیسے کاشکے کے عوض کاش، سکھلانا میں لام، اور ملک کا لام نکال دیا گیا، آوے، جاوے، بجھا دے میں واؤ فضول ہے، ہمزہ کافی ہے، اس قسم کے بہت سے تغیرات اور اصلاحات عمل میں آئے ہیں۔"[1]

ناطق مرحوم شاعری برائے شاعری کے قائل نہ تھے، بلکہ شاعری برائے زندگی کے

۱؎ مقدمہ دیوانِ ناطق - ص ۵۱،

قائل تھے، اور زندگی بھی ایسی جو با مقصد ہو اور جس کے سامنے کوئی اعلیٰ نصب العین ہو، چنانچہ فرماتے ہیں:-

"ہر انسان کی زندگی کا کچھ نہ کچھ مقصد ہوتا ہے، یا خود بخود ہو جاتا ہے، سوا اس کے جو بے اصولی اور تلوّن کے ساتھ زندگی گزارتا ہے، اس مقصدِ حیات کی روح اکثر اعمال و افعال میں جاری و ساری رہتی ہے، مثلاً مولانا جلال الدین رومیؒ نے اپنی زندگی مواعظ حسنہ کے لئے وقف کر دی تھی، لہٰذا اُن کی مثنوی میں یہ عنصر غالب ہے، یا شیخ سعدی کا منشاے حیات یہ تھا کہ انسانوں کو معاش و معاد کے بہترین ذرائع کی تعلیم سے انسان کامل بنائیں، اُن کا یہ خیال اُن کی تصنیفات سے ظاہر ہے، ...... مگر جو شاعر آزاد شاعر ہے، اور کوئی خاص مقصد اس نے اپنی حیات کا مقرر یا غالب نہیں رکھا ہے، یا یوں سمجھئے کہ اس کی زندگی کا مقصد سوا شاعری کے اور کچھ نہیں ہے، اس کی زندگی کو شاعری اپنے جال میں اس طرح جکڑ لیتی ہے، جس طرح انسان و حیوان کی شریانیں کہ وہ عمر بھر اس جال سے نکل نہیں سکتا، اور عجیب و غریب طبیعت کا انسان بن کر برائے نام انسان رہ جاتا ہے"[۵۱]

ان کے خیال میں اخلاقِ حسنہ اور کمالِ فن کا ماخذ ایک ہے، فرماتے ہیں:-

"شاعر کو اصلی معنوں میں نیک اور خلیق ہونا چاہئے، کیونکہ اخلاقِ حسنہ اور کمالِ فن کا ماخذ ایک ہے، اصلی معنوں میں بدنفس کبھی اچھا شاعر نہیں ہو سکتا کیونکہ مضمون ذہن سے متعلق ہے، لطافتِ ذہن سے ادب کا فیضان مبدا فیاض سے

---

۵۱ دیوانِ ناطق - ص ۵۱-۵۲،

ہوتا ہے، خبثِ نفس کی استعداد فیضانِ روحی سے بہت دور ہے، غیبی اعانت نیک نفس کے لئے مخصوص ہے"[۵۲]

اپنے مقدمے کے آخر میں اپنی شاعری کے اغراض و مقاصد ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:-

"اپنی شاعری میں میں نے اکثر موقعوں پر چند امور کا لحاظ رکھا ہے، کوئی پیغام یا کسی حقیقت کا اظہار، یا کسی راز کا انکشاف یا حسن و عشق کے پیرایے میں کسی مسئلہ کا حل یا حسنِ تعلیل کا ضروری اور اہم مظاہرہ"[۵۳]

اس میں شک نہیں کہ مذکورہ بالا تمام خوبیاں ان کی شاعری میں موجود ہیں، اُن کی غزلوں میں غیر اخلاقی اشعار یا پست مضامین نہیں ملتے، فکر و نظر کی بلندی اور پاکیزگی اُن کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے، نمونۃً چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں:-

جو نہ سنبھلا ابتدائے عشق میں — پھر وہ آخر تک سنبھل سکتا نہیں
غم سے جس کا دل نہ ہو پگھلا ہوا — وہ کسی سانچے میں ڈھل سکتا نہیں

ہر اشارے میں ہے اک معنیٔ بے لفظ نہاں — گفتگو کب تری محتاج صدا ہوتی ہے

فراقِ یار کا خطرہ وصالِ یار میں ہے — خزاں کی فکر خزاں میں نہ تھی بہار میں ہے

وہ جب بیمار کی پرسش کو آئیں — طبیعت کو پھر اس کی پوچھنا کیا

جانکنی سے کم نہ تھی تکلیفِ وقتِ انتظار — لیکن اس تکلیف میں اک طرح کا آرام تھا

دوبارہ دل میں کوئی انقلاب ہو نہ سکا — تمہاری پہلی نظر کا جواب ہو نہ سکا

تسکین کس طرح ہو تصور سے آپ کی — صورت میں ہے جو بات وہ تصویر میں نہیں

---

۵۲ دیوانِ ناطق - ص ۴۵ - ۵۳ دیوانِ ناطق ص ۶۴،

کیا سوچتے ہو اب تم سن کر مرا فسانہ
واپس نہ لا سکوگے گزرا ہوا زمانہ

فلسفہ وحکمت سے حکیم ناطق کو خاص ربط تھا، اگر یہ کہا جائے کہ غالب کی طرح ان کا ذہن بھی فلسفیانہ واقع ہوا تھا تو بے جا نہ ہوگا، اس لئے کہ وہ زندگی کے ہر واقعہ اور تجربے سے فلسفیانہ نتائج اخذ کر لیتے تھے، اور بڑی خوبی سے انھیں اشعار کے سانچے میں ڈھال دیتے تھے، شاعر کی یہی خوبی اس کے کلام کو لازوال اور آفاقی قدروں کا حامل بنا دیتی ہے اور اس کے کلام میں بلندی اور گہرائی پیدا ہو جاتی ہے، چند حکیمانہ اشعار دیکھئے،

کہہ رہا ہے شورِ دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

خدا ہی کو تھا یہ منظور ناطق
ڈبو سکتا ہے کشتی ناخدا کیا

قبل اس کے کہ فلک بے سر و ساماں کر دے
چاہیے اپنے کو خود بے سر و ساماں کر

فلک کیا بدلتا مرا حال ناطق
مگر میں نے خود اپنی حالت بدل دی

غلط ہے کہ ناطق ہے اک مردِ عاقل
اگر عقل ہوتی تو دیوانہ ہوتا

حال اپنا کس سے کہئے سنتا ہے کون کس کی
فرصت نہیں کسی کو اپنی ہی داستاں سے

کل بھی ہوگا عذاب کیا یا رب
آج خوفِ عذاب کیا کم ہے

ناطق کے کلام میں تصوف کے مضامین بھی موجود ہیں لیکن یہ محض برائے شعر گفتن نہیں، بلکہ تصوف میں وہ خود بھی ڈوبے ہوئے تھے، اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ پہلے وہ وحدت الوجود کے قائل نہ تھے لیکن جب سہسرام میں حضرت حسن جان صاحب سے اس مسئلہ پر بحث ہوئی جس کا سلسلہ ایک ہفتہ تک چلتا رہا۔ تو اس میں ناطق کو شکست ہوئی اور اسی وقت سے وہ وحدت الوجود کے قائل ہوگئے، ناطق کی صوفیانہ شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ قدما کی طرح اپنے صوفیانہ اشعار میں کعبہ و شیخ، اسلام و ایمان

زاہدوں اور پیغمبروں کی تضحیک نہیں کرتے، عشق حقیقی کی چند جھلکیاں دیکھئے، :-

سب جس سے مانگتے ہیں میں اس سے مانگتا ہوں
سنتا ہے جو دعائیں وہ میرا مدعا ہے

ناطق تری خوشی کیا اور تیری ناخوشی کیا
تو بندۂ خودی ہے یا بندۂ خدا ہے

منزلِ عشقِ حقیقی کی اسے راہ ملی
کوچۂ حسن مجازی سے جو ناکام آیا

مجھ کو ہے اختیار دوا و دعا مگر
کیا کیجئے کہ حکم قضا و قدر نہیں

ناطق لکھنوی کے دیوان میں ایک طویل مرثیہ بھی ہے، جس میں واقعات کربلا شروع سے اخیر تک تاریخی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے بیان کئے گئے ہیں، دیوان میں دو قصیدے بھی ہیں، ایک نعتیہ ہے، دوسرا حضرت غوث الاعظم کے مناقب میں ہے، تقریباً نو سو (۹۰۰) اشعار کی ایک عشقیہ مثنوی "حدا و عذرا" بھی اُن کے دیوان میں موجود ہے، ناطق نے رباعیاں بھی کافی تعداد میں لکھی ہیں، جو تقریباً سب کی سب اخلاقی اور حکیمانہ ہیں، مثلاً :-

اللہ کی قدرت کی خبر دیتا ہے
انسان کی فطرت کی خبر دیتا ہے
جو مخبر صادق ہے ازل سے سچا
وہ ہم کو قیامت کی خبر دیتا ہے

دنیا میں مذاہب کی بہت ہیں قسمیں
انسان کی اصلاح مگر ہے کس میں
یوں سمجھو کہ اتنا ہی وہ مذہب حق ہے
تکمیل ہے انسان کی جتنی جس میں

ہر چند خرد جوہرِ انسانی ہے
لیکن یہی سب کچھ کرے نادانی ہے
ظاہر کے لئے ہیں یہ علوم اور عقول
باطن کے لئے قوتِ روحانی ہے

وفیات

ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی

از جناب پروفیسر مسعود حسن صاحب، صدر شعبۂ عربی مولانا آزاد کالج کلکتہ

ایتھا النفس اجملی جزعا   إنّ ما تحذرین قد وقعا

اوس بن حجر کا یہ شعر سیکڑوں بار پڑھا ہوگا، لیکن استاذ محترم ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی کی وفات ہوئی تو معلوم ہوتا تھا کہ شاعر نے اسی موقع کے لیے کہا ہے۔

ڈاکٹر صاحب ایک متبحر عالم قرآن و حدیث کے بالغ نظر نکتہ شناس، وسیع النظر محقق، تجربہ کار ماہر تعلیم، بے مثل استاد اور بلند مرتبت اور پُروقار شخصیت کے انسان تھے۔ مرحوم بیماری اور کبر سنی کی وجہ سے بے حد کمزور ہوگئے تھے، اور کئی سال سے خانہ نشین تھے گذشتہ سال اپریل میں ان کی حالت ایسی تشویش ناک ہوگئی تھی کہ نرسنگ ہوم میں داخل کرنا پڑا، مگر اللہ نے دو ہفتے میں صحتیاب کر دیا۔ اسی سال مارچ کے پہلے ہفتے میں گردے میں مہلک خرابی پیدا ہوئی۔ پانچ چھ دن بیہوش رہے، اور آخر ۱۰ مارچ ۱۹۶۶ء یوم پنجشنبہ کی سہ پہر کو ۱/۲ ۳ بجے ان کی شمع حیات ہمیشہ کے لیے گل ہوگئی، وفات کے وقت ان کی عمر تقریباً نوّے سال تھی، اسی دن شب کو ۱/۲ ۱۰ بجے جنازہ ان کی کوٹھی کے سامنے پارک سرکس میدان میں لایا گیا، عزیزوں، دوستوں، عقیدت مندوں اور شاگردوں کی کثیر تعداد ساتھ تھی

نماز جنازہ کے بعد ان کا جسد خاکی قبرستان لے جایا گیا، اور تقریباً بارہ بجے مخلصوں کی گریۂ نیم شبی کے درمیان سپرد خاک کر دیا گیا۔

اے تیرہ خاک خاطر مہماں نگاہ دار   کیں نورِ چشم ماست کہ در بر گرفتۂ

اللہ ان کی تربت پر رحمت کے پھول برسائے، اور دنیا کی طرح عقبیٰ میں بھی انھیں اونچا مقام عطا فرمائے۔ ڈاکٹر صاحب اب ہمارے درمیان موجود نہیں۔ مگر ان کے عظیم الشان کارنامے ہمیشہ نظروں کے سامنے رہیں گے، اور ان کی محبت و احترام سے ہمارے دل ہمیشہ لبریز رہیں گے۔

جمالك فی عینی وحبك فی قلبی   وذکرك فی فمی فاین تغیب؟

ڈاکٹر صدیقی صاحب صوبۂ بہار کے ایک معزز علمی اور مذہبی خانوادے کے چشم و چراغ تھے، آباد اجداد کا قدیم مسکن ایک چھوٹا سا گاؤں گُھرار تھا، جو پٹنہ (بانکی پور) کے جنوب میں کئی میل کے فاصلے پر واقع ہے، خاندان کے بعض بزرگ پٹنہ سٹی کے ایک محلہ منگل تالاب میں منتقل ہوگئے تھے، اور یہیں ان کی ولادت ہوئی، پدر بزرگوار حافظ حکیم مولوی محمد اسحٰق صاحبؒ شہر کے مشہور طبیب اور مقدس بزرگ تھے، ان کا مزار اب تک مرجع خاص و عام ہے، ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی تعلیم والد ماجد کی نگرانی میں ہوئی، پھر درسیات کا اچھا خاصہ حصہ بخشی محلہ پٹنہ کے مدرسۂ حنفیہ میں پورا ہوا، جسے قاضی عبد الودود صاحب کے والد ماجد قاضی عبد الوحید مرحوم نے قائم کیا تھا اور وہی اس کے اخراجات کے کفیل تھے، عرصہ ہوا یہ مدرسہ ختم ہوگیا ہے، یہاں انھوں نے طب یونانی کی تعلیم بھی حاصل کی یہاں کے اساتذہ میں مولانا عبد اللہ صاحب پنجابی، مولانا حکیم عبد العزیز صاحب منطقی سہانپوری اور مولانا حکیم محمد نجم الدین صاحب دانا پوری خاص طور سے قابل ذکر ہیں، ان ہی دونوں

مولانا عبدالعزیز صاحب کا تقرر مدرسۂ عالیہ رام پور میں ہو گیا، اور ڈاکٹر صاحب اسلامیات اور طب کی تکمیل کے لیے ان کے ساتھ رام پور بھیج دیے گئے، یہاں دوسرے صاحب نظر اساتذہ کے ساتھ انھیں مولانا فضل حق رامپوری سے استفادہ کا بھی موقع ملا، اس مدرسہ سے فراغت کے بعد وہ لاہور کے اورینٹل کالج میں داخل ہوئے، جو ان دنوں مشرقی علوم کا بڑا اہم مرکز تھا، اور جہاں پروفیسر محمد شفیع اور پروفیسر اقبال جیسے فضلائے روزگار موجود تھے، ۱۹۱۲ء میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان درجۂ اول میں پاس کیا، اور وطن واپس آگئے، ۱۹۱۲ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے میٹرکولیشن کے امتحان میں بھی اوّل درجے میں کامیاب ہوئے، پھر بہار نیشنل کالج سے آئی۔ اے اور بی۔ اے کے امتحانات اور پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔ ایل اور ایم۔ اے (فارسی) کے امتحانات امتیاز و تخصص کے ساتھ پاس کیے، ایم۔ اے کے امتحان میں ایسی شاندار کامیابی حاصل کی کہ حکومت بہار و اڑیسہ نے یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ان کو ایک گرانقدر وظیفہ عطا کیا، انگریزی کی تکمیل کے بعد انھوں نے پٹنہ میں ایک سال وکالت کی۔ ان کے بچپن کے ایک رفیق کا جن کا ذکر بعد میں آئے گا بیان ہے کہ کچھ دنوں انھوں نے اپنے والد مرحوم کی رہنمائی میں طبابت بھی کی، طب کی باقاعدہ تعلیم وہ پہلے ہی حاصل کر چکے تھے، علاج و معالجہ اور تشخیص امراض کی مشق اور ایک کامل فن کی تربیت نے ان کے اندر وہ تمام صلاحتیں پیدا کر دیں جن کی بنا پر آگے چل کر طب ان کی تحقیقات علمی کا ایک خاص موضوع بن گیا۔

۱۹۲۰ء میں وہ ولایت تشریف لے گئے، اور ان کی علمی مشغولیتوں اور تحقیقی کاوشوں کا سب سے اہم دور شروع ہوا، وہاں ان کا داخلہ کیمبرج یونیورسٹی کے کنگز کالج میں ہوا،

انھوں نے یورپ کے مشہور مستشرق پروفیسر ایڈورڈ جی۔ براؤن کی نگرانی میں، عربی زبان میں طبی ادب کا ارتقاء کے موضوع پر ایک محققانہ مقالہ لکھا، جس پر یونیورسٹی نے انکو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی، اس دوران میں پروفیسر براؤن کی تحریک اور اصرار پر عربی زبان کی ایک قدیم ترین اور اہم کتاب فردوس الحکمۃ بھی ایڈٹ کی اور اس پر عربی میں فاضلانہ مقدمہ لکھا، یہ کتاب ۱۹۲۸ء میں ان کے ہندوستان آنے کے بعد شائع ہوئی، اور اس نے ان کو علمی دنیا میں ایک فاضل محقق کی حیثیت سے روشناس کیا۔

ابھی وہ ولایت ہی میں تشریف رکھتے تھے کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و علوم مشرقی کے پروفیسر اور صدر کی جگہ کے لیے ایک لائق استاذ کی تلاش ہوئی، اور پروفیسر براؤن سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا گیا، انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو نامزد کیا، اور ڈاکٹر صاحب نے ہندوستان واپس آکر ۱۹۲۶ء میں اس عہدے کا چارج لیا، لکھنؤ یونیورسٹی میں ابھی دو سال بھی اپنے فرائض انجام نہیں دے سکے تھے کہ کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی کے صدر کی جگہ ان کا تقرر ہو گیا، ڈاکٹر صاحب کی علمی اور تعلیمی زندگی کا سب سے بڑا اور اہم حصہ اسی یونیورسٹی میں گذرا ہے، یہاں رہ کر پورے ۳۳ سال تک (۱۹۲۹ء تا ۱۹۶۲ء) وہ نہ صرف یونیورسٹی بلکہ پورے صوبہ میں عربی، فارسی، اور اردو اسلامیات کی تعلیم کے اہم مسائل طے کرنے میں پیش پیش رہے، اسی زمانہ میں ان کی متعدد تصنیفات حلیۂ طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئیں، انھوں نے بے شمار علمی مقالے لکھے، ہند اور بیرون ہند کی بہت سی علمی اور تعلیمی کانفرنسوں میں شرکت فرمائی، اور خطبات پڑھے، ان کے تبحر علمی کی بنا پر اسلامک کلچر

اور شعبۂ عربی و فارسی کا اعتبار سارے ملک میں قائم ہوا، جب ۱۹۴۰ء میں سر عزیز الحق وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی کی کوششوں سے یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ و ثقافت کا نیا شعبہ قائم ہوا، تو اس کی صدارت بھی ڈاکٹر صاحب کو تفویض کی گئی، اور کئی سال تک وہ اس کے بھی صدر رہے۔ اس کے علاوہ وہ یونیورسٹی کی ملازمت کے زمانے میں سینیٹ اور سنڈیکیٹ کے ممتاز ممبر بھی رہے، اور یونیورسٹی کے تمام کاموں میں نمایاں حصہ لیتے رہے، وہ یونیورسٹی میں ہمیشہ ہر حلقہ میں نہایت عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ بنگال کے علاوہ پورے ہندوستان کے علمی اور تعلیمی حلقے آپ کے فضل و کمال کے معترف تھے۔ حکومت ہند نے عربی، فارسی اور سنسکرت کے علما کے اعزاز کے سلسلے میں جو اسکیم تیار کی، اس کے ماتحت عربی کا پہلا اعزاز ۱۹۵۸ء میں آپ کو ملا۔ یہ ایک سند علمی، ایک خلعت اور تاحیات وظیفہ پر مشتمل تھا، ۱۹۶۲ء میں آپ حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنے بعد ہندوستان اور ہندوستان کے باہر بیشمار شاگردوں، دوستوں، عقیدت مندوں اور عزیزوں کو سوگوار اور اشکبار چھوڑا اعزہ میں محترمہ بیگم صدیقی صاحبہ، تین صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں خاص طور پر ہمدردی کے مستحق ہیں، بیگم صاحبہ بہار شریف کے ایک بڑے ممتاز خاندان سے تعلق رکھتی ہیں، ہم نے ڈاکٹر صاحب کو اکثر ان کے حسن انتظام اور ان کی خوش سلیقگی کے باب میں رطب اللسان پایا۔ بڑے صاحبزادے ڈاکٹر محمد خالد صدیقی کلکتہ کے مشہور اور کامیاب ماہر امراض قلب ہیں، منجھلے محمد شاہد صدیقی اور چھوٹے محمد کامل صدیقی امریکہ میں اعلیٰ تعلیم پا رہے ہیں، دو صاحبزادیاں بڑی اور منجھلی شادی شدہ ہیں، سب سے چھوٹی جو ڈاکٹر صاحب کو اپنی اولاد میں بہت عزیز تھی، زیر تعلیم ہے۔

ڈاکٹر صاحب جہاں بھی رہے، پوری یکسوئی، اور جگر سوزی کے ساتھ علمی تحقیقی اور تعلیمی کام انجام دیتے رہے، وہ ملکی اور غیر ملکی علمی کانفرنسوں میں شریک ہوتے، اور سارے ہندوستان کے علمی اداروں اور یونیورسٹیوں کے انتظامی اور تعلیمی امور میں مشورے دیتے جب تک ان کی صحت نے ساتھ دیا ان خدمات کا سلسلہ جاری رہا، انکے علمی انہماک کا یہ عالم تھا کہ ضعف بصارت کی وجہ سے جب لکھنے پڑھنے میں کافی دقت ہونے لگی، تب بھی ان کی علمی مشغولیت میں کوئی فرق نہیں آیا کسی شاگرد کو پکڑ لیتے اس سے کتابیں پڑھواتے، اس کو املا کراتے، اسے اپنی کار میں لائبریری لے جاتے، اور وہاں اس سے مدد لیتے، آخری زمانے کا واقعہ ہے، ایک دن راقم ان سے ملنے کے لیے گیا، اس وقت انھیں تنفس کی سخت تکلیف تھی، میں نے عرض کیا کہ بے کاری میں آپ کو بہت بے لطفی محسوس ہوتی ہوگی؟ انھوں نے فرمایا نہیں میں تو کام کرتا رہتا ہوں پھر سامنے کی الماری پر ایک جرمن یا فرانسیسی کتاب کی دو ضخیم جلدوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے " میں ان دونوں جلدوں کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہتا ہوں"، میں نے عرض کیا کہ اس میں تو بہت وقت لگ جائے گا۔ انھوں نے فرمایا نہیں صرف دو مہینے"، پیرانہ سالی کے باوجود ان کی یہ جوان ہمتی دیکھکر مجھے اپنے آپ پر شرم آنے لگی۔

استاذ مرحوم کی چند اہم تصنیفات و تالیفات کی فہرست درج ذیل ہے۔

(۱) فردوس الحکمۃ (فی الطب) یہ ابو الحسن علی بن سہل ابن الطبری کی ایک اہم تصنیف ہے۔ جو ۸۵۰ء میں لکھی گئی تھی یہ عربی میں طب کی قدیم ترین کتاب ہے، جس میں اس عہد تک کے سارے طبی معلومات جمع کر دیئے گئے ہیں اس کتاب کی طرف

سے پہلے پروفیسر براؤن نے توجہ کی جو تاریخ ادبیات فارسی کے مصنف ہونے کے علاوہ عربی زبان میں طبی معلومات کے موضوع پر ایک ماہر مستشرق کی حیثیت کو بڑی شہرت کے مالک ہیں، پروفیسر موصوف نے اس کتاب کا ایک حصہ ایڈٹ بھی کر لیا تھا، مگر بعض مجبوریوں کی بنا پر اس کام کو جاری نہ رکھ سکے

جب ڈاکٹر صاحب کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوئے تو انھوں نے یہ اہم کام ان کے سپرد کیا۔ یہ کام بڑا مشکل اور بیحد محنت طلب تھا کوئی اور ہوتا تو گھبرا جاتا، مگر ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کو نہ صرف ایڈٹ کیا اور اس پر فاضلانہ مقدمہ لکھا، بلکہ ایک ہندوستانی مخطوطے کی مدد سے اس کے نامکمل حصے کو مکمل بھی کیا یہ کتاب برائے گب میموریل ٹرسٹ کے زیر اہتمام ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی۔

(۲) السیر الحثیث فی تاریخ تدوین الحدیث۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا وہ عربی مقالہ ہے، جو انھوں نے تاریخ علم الحدیث پر دائرۃ المعارف حیدر آباد کے ایک جلسہ میں ۱۹۳۹ء میں پڑھا تھا، اور جو بعد میں مطبع دائرۃ المعارف سے ۱۳۵۸ھ میں شائع ہوا تھا۔ اس مقالے میں فن حدیث کی تاریخ اور حدیث نبوی کے اہم مسائل سے بحث کی گئی ہے۔

(۳) تاریخ نامۂ ہراۃ۔ یہ ہرات کی تاریخ ہے جسے فاضل مورخ سیف بن محمد بن یعقوب الہروی نے ملک غیاث الدین کرت کی فرمائش پر لکھا، یہ چنگیز خان کے حملۂ ہرات سے لیکر غیاث الدین کرت کے عہد تک کی ایک مستند تاریخ ہے اسکا واحد مخطوطہ امپیریل لائبریری (موجودہ نیشنل لائبریری) کے بوہار سیکشن میں محفوظ تھا، لائبریری کے سابق ناظم خان بہادر خلیفہ محمد اسد اللہ مرحوم کی تحریک پر ڈاکٹر صدیقی

صاحب نے بڑی محنت اور عرق ریزی کے بعد اس کو ۱۹۴۴ء میں ایڈٹ کیا اور اس پر انگریزی میں ایک بسیط اور پر از معلومات مقدمہ لکھا۔

(۴) اسٹڈیز ان عربک اینڈ پرشین میڈیکل لٹریچر (STUDIES IN ARABIC AND PERSIAN MEDICAL LITERATURE) یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کی ایک اہم تصنیف ہے، اس میں انھوں نے عربی اور فارسی زبانوں میں آغاز اسلام سے ابتدائے عہد بنی عباس تک کے طبی سرمایہ کا جائزہ لیا ہے، اور مختلف اہم طبی مسائل پر عالمانہ بحث کی ہے۔ ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے سابق وزیر اعلیٰ مغربی بنگال نے اس پر پیش لفظ لکھا ہے یہ کتاب کلکتہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔

(۵) حدیث لٹریچر (HADITH LITERATURE) - طب کی طرح فن حدیث سے بھی ڈاکٹر صاحب کو گہری دلچسپی رہی ہے، چنانچہ انھوں نے اسی موضوع پر مختلف تحقیقی مضامین اردو اور انگریزی میں شائع کئے، سالہا سال کی اس محنت کے نتائج ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں محفوظ کر دیئے ہیں، یہ انگریزی زبان میں فن حدیث کی سب سے پہلی مستند اور جامع کتاب کہی جا سکتی ہے۔ یہ کتاب بھی کلکتہ یونیورسٹی کے اہتمام سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی۔

(۶) دی سوشل پوزیشن آف وومین تھرو دی ایجز (THE SOCIAL POSITION OF WOMAN THROUGH THE AGES) یہ دراصل ڈاکٹر صاحب کے وہ تین انگریزی خطبات ہیں جو انھوں نے سر عبد اللہ میموریل لکچرر کی حیثیت سے ۲۹ ستمبر اور پہلی اور تیسری اکتوبر ۱۹۶۲ء کو کلکتہ یونیورسٹی میں دیئے تھے، پہلے خطبے میں عورت کی حیثیت زمانۂ قدیم میں، دوسرے خطبے میں اس کی حیثیت ازمنۂ وسطیٰ کے مغربی معاشرے میں

اور تیسرے خطبے میں "عورت کی حیثیت اسلام میں" پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ یہ خطبات بھی کلکتہ یونیورسٹی کی طرف سے ۱۹۷۱ء میں شائع ہوگئے ہیں۔

اپنی پچاس سالہ علمی زندگی میں ڈاکٹر صاحب نے ہندوستان کے مختلف علمی رسائل و مجلات مثلاً "معارف"، اسلامک کلچر، کلکتہ ریویو اور "اسلام اور عصر جدید" میں بے شمار علمی و تحقیقی مضامین لکھے جن سے ڈاکٹر صاحب کے علم کی گہرائی، تنوع اور مطالعہ کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسلامیات کے متعلق ہندوستان کا شاید ہی کوئی ادارہ ہوگا، جس سے ان کا گہرا تعلق نہ ہو، ندوۃ العلماء لکھنؤ، دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن، دارالمصنفین اعظم گڈھ، خدابخش لائبریری پٹنہ، رام پور اسٹیٹ لائبریری، سالار جنگ میوزیم، آصفیہ لائبریری حیدرآباد، اور ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں وہ ہمیشہ سرگرم عمل نظر آئے، ہندوستان کی ان تمام یونیورسٹیوں سے جہاں عربی، فارسی اور اسلامیات کی تعلیم کا انتظام ہے، وہ ہمیشہ منسلک رہے، اور یہاں ان کے مشورے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، ملک کے بہت سے اسلامی مدارس کے علمی اور انتظامی امور میں ڈاکٹر صاحب کے مشوروں کو بڑا دخل تھا، مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ اور مدرسہ عالیہ کلکتہ کے نصاب تعلیم کی تشکیل میں انھوں نے بڑا حصہ لیا، مدرسہ عالیہ کلکتہ سے تو تقسیم بنگال سے پہلے اور اس کے بعد برابر ان کا تعلق رہا، وہ اس کی گورننگ باڈی کے چیرمین اور مدرسہ بورڈ کے ممتاز رکن تھے، مشرقی علوم سے متعلق ہندوستان اور بیرون ہند کی کانفرنسوں میں وہ بالعموم شریک ہوتے تھے، بین الاقوامی اورنٹیل کانگریس کے کئی جلسوں میں، جو ایشیا اور یورپ کے مختلف ممالک میں منعقد ہوئے، انھوں نے شرکت فرمائی، اور تحقیقی مقالے پڑھے، وہ ڈھاکہ کی اس آل پاکستان ہسٹوریکل کانفرنس میں بھی تشریف رکھتے تھے جس میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے خطبہ کے خلاف

اردو دشمن عناصر نے بڑا نازیبا مظاہرہ کیا تھا، ڈاکٹر صاحب کو اس ناشایستہ حرکت سے بڑا قلق ہوا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کے اساتذہ کرام میں مولانا عبداللہ صاحب پنجابی، مولانا حکیم عبدالعزیز صاحب منطقی سہارنپوری، مولانا حکیم محمد نجم الدین صاحب داناپوری، مولانا فضل حق صاحب رامپوری، ڈاکٹر عظیم الدین (پٹنہ) پروفیسر محمد شفیع (لاہور) پروفیسر محمد اقبال (لاہور) پروفیسر اے۔ اے بیوان اور پروفیسر ایڈورڈ جی۔ براؤن کے نام ذہن میں محفوظ ہیں جن اکابر وقت سے ان کو عقیدت تھی، یا جن کا نام وہ احترام کے ساتھ لیا کرتے تھے، ان میں سر فخر الدین وزیر تعلیم بہار و اڑیسہ، سر عبداللہ سہروردی، سر حسان سہروردی، سر عزیز الحق، ڈاکٹر رادھا کرشنن پروفیسر رینالڈ اے نکلسن، علامہ سید سلیمان ندویؒ، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر ہرنیدر کمار مکھرجی، اور ڈاکٹر بی۔ سی رائے، خاص طور پر قابل ذکر ہیں، علامہ سید سلیمان ندویؒ کے علم و فضل اور اخلاق و کمالات کے بڑے قدردان تھے، اپنی عقیدت و نیازمندی کا اظہار اپنے اس مقالہ میں کیا ہے جو معارف سلیمان نمبر میں شائع ہوا ہے، ہمعصروں اور ہم چشموں میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الہ آباد) ڈاکٹر شیاما پرشاد مکھرجی، پروفیسر ہمایوں کبیر، ڈاکٹر سونیتی کمار چٹرجی (نیشنل پروفیسر) ڈاکٹر نظام الدین، پروفیسر ہارون خان شروانی، مسٹر اے۔ اے فیضی، ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، پروفیسر محمد محفوظ الحق سابق صدر شعبہ عربی و فارسی و اردو پریسیڈنسی کالج (کلکتہ) ڈاکٹر عندلیب شادانی (ڈھاکہ)، ڈاکٹر محمد اسحٰق (کلکتہ) مولانا عبدالعزیز میمن، مولانا فضل الرحمٰن باقی (غازیپور) حکیم نور الحسن صاحب (پٹنہ)، حکیم مظہر امام صاحب رئیس پٹنہ اور قاضی عبدالودود صاحب

بیرسٹرایٹ لا (پٹنہ) سے وہ بڑے گہرے دوستانہ روابط اور بےتکلفانہ مراسم رکھتے تھے، یہ دونوں بزرگ ان کے بچپن کے رفیق ہیں، اور خدا کا شکر ہے کہ دونوں بقید حیات ہیں، منظر امام صاحب مدرسۂ حنفیہ میں انکے ہم سبق تھے، اور ڈاکٹر صاحب جب پٹنہ جاتے تو ان سے ضرور ملاقات کرتے تھے، قاضی صاحب سے جو خلوص تھا، اس کا اندازہ ان الفاظ سے ہوتا ہے جو ڈاکٹر صاحب نے سر عبداللہ میموریل لکچر کے آغاز میں انکی طرف خطبہ کا انتساب کرتے ہوئے لکھے ہیں، اور جس میں انھوں نے حافظ شیراز کا یہ شعر بھی نقل کیا ہے۔

فعیشک راحتی فی کل حین وذکرک مونسی فی کل حال

ڈاکٹر صاحب مرحوم کے شاگردوں کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ یہاں اس کی مختصر سے مختصر فہرست بھی پیش نہیں کی جا سکتی ہے، اپنی چہل سالہ تدریسی زندگی میں انھوں نے اپنی نظر کیمیا اثر سے نہ معلوم کتنے مس خام کو کندن بنا دیا، ان کے علم کی تابانی سے بہت سے ذرے آفتاب بن گئے، اور ان کی نگاہ جوہر شناس نے کتنے ہی موتیوں کو در شہوار بنا دیا۔ یہ سطریں لکھتے وقت جن ارشد تلامذہ کے نام حافظہ کے افق پر ابھر رہے ہیں، صرف ان کی فہرست پیش خدمت ہے۔

مولانا حافظ عبدالحفیظ سابق پرنسپل مدرسۂ عالیہ ڈھاکہ، مولانا حافظ عبدالحی سابق پرنسپل مدرسۂ چاٹگام، مولانا محمد اکبر ندوی ریڈر شعبہ عربی و فارسی کلکتہ یونیورسٹی، ڈاکٹر امام الدین صدر شعبۂ اسلامی تاریخ و ثقافت ڈھاکہ یونیورسٹی، پروفیسر محمد اسمٰعیل مولانا آزاد کالج کلکتہ، ڈاکٹر محمد صابر خان ممبر پبلک سروس کمیشن مغربی بنگال، خواجہ محمد یوسف ایڈوکیٹ ہائی کورٹ، سید ابوبکر حسنی (نہرو یونیورسٹی دہلی)، ڈاکٹر عطا کریم برق

صدر شعبہ فارسی و عربی کلکتہ یونیورسٹی، مسٹر محمد عبدالمجید جنرل سکریٹری ایران سوسائٹی (کلکتہ)، لکھنؤ یونیورسٹی سے وابستگی کے زمانہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی ڈاکٹر صاحب سے استفادہ کیا ہے۔[1]

کلکتے میں جن بے شمار لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اُن میں ہیچمدان راقم السطور بھی داخل ہے، گوش آشنا تو شمس الہدیٰ پٹنہ کی طالب علمی کے زمانہ (۱۹۳۲-۳۵ء) سے تھا، ۱۹۳۵ء میں جب کہ پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں داخل ہوا تو مختلف مجلسوں میں ڈاکٹر صاحب کو دور سے دیکھنے اور تقریریں سننے کا موقع ملا۔ اس وقت تک میں مغربی وضع قطع کے لوگوں کے منہ سے قرآن و حدیث کی باتیں سننے کا عادی نہیں ہوا تھا، مدرسہ کی تعلیم کی کچھ خشونت ابھی باقی تھی، اس لیے شروع شروع میں ایسے موقعوں پر مدرسی عصبیت کی بنا پر دل میں انقباض پیدا ہوتا تھا، مگر شکر ہے کہ تشکیک کی یہ منزل بہت جلد طے ہو گئی، ۱۹۴۱ء کے وسط میں کلکتہ یونیورسٹی میں طالب علم کی حیثیت سے پہونچا تو ڈاکٹر صاحب کے حلقۂ درس میں شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی، براہ راست استفادہ کا موقع ملا، ان دنوں وہ ایم۔ اے (عربی) میں ابن قدامہ کی نقد الشعر اور تاریخ اسلام کا درس دیا کرتے تھے، ان کی عربی دانی، تاریخ ادبیات عرب سے گہری واقفیت اور وسعت مطالعہ نے میرے دل پر سکہ جمانا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ میں ان کا گرویدہ ہو گیا۔ ایم اے کے بعد جب ان کی نگرانی میں علمی تلاش و تحقیق کا کام شروع کرنے کا شرف حاصل ہوا،

---

[1] گذشتہ صفحات میں بہت سے بزرگوں اور رفیقوں کے نام آئے ہیں، ان میں سے کتنے اس دنیائے فانی سے رخصت ہو چکے ہیں، کتنے ایسے ہیں جن کے متعلق مجھے معلوم نہیں ہے کہ وہ بقید حیات ہیں یا اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مرحومین کیلئے دعائے مغفرت کرتا ہوں، احباب اور رفقا میں کوئی قابل ذکر نام اگر درج ہونے سے رہ گیا ہو تو وہ معاف فرمائیں کہ یہ عمداً نہیں بلکہ سہواً ہے۔

تو اور قربت بڑھی۔ اب میں ان کے دولت کدے پر بھی حاضر ہونے لگا۔ انھوں نے ابن حزم اندلسی کی جمهرۃ الانساب کے متن کی تہذیب و تصحیح اور ابن حزم کے حالات زندگی کی ترتیب کا کام میرے سپرد کیا، اسوقت تک جمهرۃ الانساب کے صرف دو قلمی نسخے موجود تھے، ایک کتب خانہ خدابخش پٹنہ میں اور دوسرا رامپور لائبریری میں تھا۔ میں نے اپنی بساط علم کے مطابق بڑی محنت کی اور دو سال تک اس کام میں لگا رہا، مگر چونکہ استاذ محترم کی علمی تحقیق کا معیار بہت بلند تھا، اور وہ اپنے شاگردوں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے، اس لیے میرے کام سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں تھے، مگر جب میں نے چپکے چپکے ابن حزم اور اس کی جمهرۃ الانساب پر انگریزی میں ایک مقالہ لکھا اور وہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے جرنل میں شائع ہوگیا تو وہ مجھ سے بہت خوش ہوئے، علمی کاموں میں ان کی سخت گیری کا ایک واقعہ جو اسی زمانہ میں میرے ساتھ پیش آیا مجھے یاد ہے، میں امپیریل لائبریری (موجودہ نیشنل لائبریری) کے بوہار سیکشن کے دار المطالعہ میں بیٹھا ہوا حسب معمول اپنے کام میں مشغول تھا، میری میز پر بہت سی کتابیں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں، اس وقت میں اتفاق سے شعر العجم میں کچھ دیکھ رہا تھا، اچانک استاذ محترم میرے قریب آئے اور یہ کہتے ہوئے کہ "ابھی آپ شعر العجم ہی میں ہیں" گذر گئے۔ ان کا یہ جملہ مجھ پر بجلی کی طرح گرا، اس وقت وہاں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے، اس لیے شرم اور ندامت سے عرق عرق ہوگیا، مگر اس جملہ نے میرے سمند شوق پر تازیانہ کا کام کیا، اور میں اپنی علمی جدوجہد میں پہلے سے زیادہ سرگرم ہوگیا۔ پھر وہ دن آیا جب استاذ محترم نے مجھے ایک سرکاری کالج کی پروفیسری کے لیے منتخب کیا۔ چند ہی برسوں کے بعد

[1] عرصہ ہوا یہ کتاب مصر سے شایع ہوگئی۔

انھوں نے اپنی کوششوں سے میرا رشتہ کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی سے بھی قائم کر دیا، اور میں وہاں بھی درس دینے لگا۔

۱۹۵۵ء کا ذکر ہے، مولانا سعید احمد اکبرآبادی پرنسپل مدرسۂ عالیہ کلکتہ مدرسہ سے نذر حال کا مصمم ارادہ کر چکے تھے، ان کی جگہ کا اعلان ہوا تو مدرسہ کے رموز و اسرار سے ناواقفیت کی بنا پر میں نے درخواست دینی چاہی۔ میں نے استاذ مرحوم سے اس سلسلہ میں مشورہ کرنا چاہا، مگر انھوں نے انکار کر دیا، اسوقت ان کی اس بے التفاتی سے میرے دل کو تھوڑی سی تکلیف پہونچی تھی، مگر بعد کے واقعات نے بتایا کہ ان کا طرز عمل درست تھا، بہر حال میں نے درخواست دیدی اور میرا انتخاب بھی ہوگیا، انتخابی کمیٹی میں دوسرے ماہرین کے ساتھ استاذ مرحوم بھی تھے، پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہوئے ابھی ایک ہی سال گذرا تھا کہ میں وہاں کی فضا سے بددل ہوکر مولانا اکبرآبادی کی طرح رخت سفر باندھنے پر مجبور ہوگیا، استاذ محترم مدرسے سے میری علحدگی کے مخالف تھے، انکے اور بعض دیگر بزرگوں کے اصرار سے میں نے وہاں تقریباً چار سال گذارے، اس پوری مدت میں میرے خلاف شدید ہنگامے ہوتے رہے، حضرۃ الاستاذ ہمیشہ ہر آڑے وقت میں میری دستگیری فرماتے اور مفید مشورے دیتے، مدرسے کے علاوہ پرنسپل کوارٹر میں پابندی سے تشریف لاتے، اور گھنٹوں مدرسہ کے پیچیدہ معاملات پر گفتگو کرتے، یہاں تک کہ میری حمایت میں وہ اہل مدرسہ کے سب وشتم کا نشانہ بھی بنے۔

۱۹۶۳ء کے اوائل میں خدا خدا کر کے مدرسہ سے رخصت ہوکر مولانا آزاد کالج میں واپس آیا تو کھویا ہوا سکون مجھے واپس ملا۔ اور ان علمی و ادبی منصوبوں کی طرف پھر توجہ کا موقع ملا، جن کا شیرازہ گذشتہ چار پانچ سال کے عرصہ میں بکھر گیا تھا۔ ع

دگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ پریشاں را

حضرۃ الاستاذ کی ہم نشینی، ان کی ہمرکابی اور ان سے علمی استفادہ کے زیادہ مواقع نصیب ہوئے۔ اب وہ بھی یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش، اور سنیٹ اور سنڈیکیٹ کی کارروائیوں کے جھگڑے سے سبک بار ہو چکے تھے، اس لیے اکثر باریابی کا موقع میسر آتا، پھر جب ان کی صحت خراب رہنے لگی، تو اکثر مزاج پرسی کے لئے انکی خدمت میں حاضر ہوتا۔ وہ ہمیشہ اپنے مرض کی تفصیلات بیان کرنے سے اغماض کرتے اور اپنی دلچسپی کی خبریں پوچھتے۔ آخری دو تین برسوں میں عام صحت کے ساتھ حافظہ بھی کمزور ہو گیا تھا، آخری ملاقات اور گفتگو ۱۳ر جنوری سنہ ۱۹۷۶ء کی صبح کو ہوئی، وہ اندر کے برآمدے میں دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے، میری آمد کی اطلاع پاکر ملاقات کے کمرہ میں داخل ہوئے تو میں نے ان کو سہارا دینا چاہا، مگر انھوں نے منع فرمایا، میں نے مزاج پرسی کے بعد ان کے بچپن کے رفیق حکیم منظر امام صاحب کا ایک پیغام سنایا اور عرض کیا کہ پٹنہ جارہا ہوں، اگر آپ انھیں کچھ کہنا یا لکھنا چاہیں تو میں یہ خدمت انجام دے سکتا ہوں، میں نے جب پہلی مرتبہ حکیم صاحب کا نام لیا تو فرمایا ہاں حکیم منظر امام میرے بچپن کے ساتھی ہیں، پھر دو تین منٹ بعد ان کا ذکر آیا تو فرمانے لگے "کون منظر امام؟ کہاں کے رہنے والے"، فروری کے مہینے میں میں ان کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔ مارچ کے مہینہ میں ان کی آخری علالت کی اطلاع مجھے بہت دیر سے ملی۔ ۷ر مارچ کی شب کو حاضر ہوا تو انھیں بسترِ مرگ پر بے ہوش دیکھا۔ ان کی تکلیف مجھ سے نہیں دیکھی گئی، دل ہی دل میں انھیں الوداع کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔ دوسرے دن مغرب سے کچھ پہلے جناب احمد سعید

ملیح آبادی صاحب اور جناب خواجہ محمد یوسف صاحب میرے غربت کدے پر یہ غمناک خبر دینے کے لیے تشریف لائے کہ استاذ مرحوم رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔

افسوس! صد افسوس!! یہ ابرِ کرم، علم و دانش، اخلاق و مذہب، فلسفہ و حکمت اور حقایق و معارف کے موتی بکھیرتا ہوا، سر سے گذر گیا، اور میں کم نصیب پوری طرح اس سے فیضیاب نہ ہو سکا۔

ابرِ رحمت دامن از گلزارِ من برچید و رفت
اندکے بر غنچہ ہائے آرزو بارید و رفت

ادبیات

غزل

از ڈاکٹر ولی الحق صاحب ولی انصاری

ہجومِ درد و غمِ دل بلا بہت ہے ابھی
دلی فلک کی روش فتنہ زا بہت ہے ابھی

یہ دیکھتا نہیں منزل ہے سامنے میرے
یہ پوچھتا ہوں کہ کیا راستا بہت ہے ابھی

خیالِ دوزخ و جنت کا ذکر کیا یارو
ہراس پرسشِ روزِ جزا بہت ہے ابھی

نہ چھیڑ نغمۂ شادی، نہ چھیڑ اے ہمدم
دلوں میں آگ ہے غمگیں فضا بہت ہے ابھی

رموزِ میکدہ سے اس کو آشنا کرتے
پہ کیا کریں کہ ولی پارسا بہت ہے ابھی

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

اشکِ پیہم کی روانی اور ہے
چشمِ دل کی خونفشانی اور ہے

ختم ہونے کو ہے رودادِ حیات
اک سکوتِ بے زبانی اور ہے

جس سے ہے منسوب دل کی داستاں
وہ فسانہ وہ کہانی اور ہے

عشق میں اس عمرِ فانی کے سوا
اک حیاتِ غیر فانی اور ہے

ربطِ الفاظ و معانی سے جدا
عشق کی معجز بیانی اور ہے

پوچھتے ہیں سن کے افسانہ مرا
کیا کوئی ایسی کہانی اور ہے

یوں تو ہر آنسو ہے طوفاں در کنار
سر سے جو گذرے وہ پانی اور ہے

ہم بھی کہہ سکتے ہیں جوہر دل کی بات
بات کچھ ان کی زبانی اور ہے

مطبوعاتِ جدیدہ

تصوف کیا ہے؟ مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت متوسط، صفحات ۱۴۴، مجلد مع گرد پوش، قیمت :- صر پتہ :- کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ،

اس کتاب کا یہ دوسرا ایڈیشن ہے، اس کے چار مضامین خود فاضل مرتب کے اور تین ندوۃ کے شیخ التفسیر مولانا محمد اویس نگرامی ندوی کے ہیں، ایک مضمون مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم کا بھی ہے، اس میں روحانی حیثیت سے بعض بلند مقام مصلحین کے کارنامے بیان کرکے دکھایا ہے کہ تصوف بے عملی اور جد وجہد سے فرار کا نام نہیں ہے، مولانا محمد اویس صاحب کے ایک مضمون میں اس کا ذکر ہے کہ علامہ ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد حافظ ابن قیم تصوف کے بعض مسائل اور متصوفین کے ایک گروہ پر سخت تنقید کے باوجود حقیقی تصوف کے مخالف نہ تھے، مگر اس میں ابن عربی پر جو کبار صوفیہ میں تھے، امام ابن تیمیہ کی تنقیدوں کا کوئی ذکر نہیں، فاضل مرتب نے تصوف کی اہمیت اور غرض و غایت واضح کرکے اس کے مروجہ اشغال کے بارہ میں شکوک کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے، کہ وہ مقصود بالذات نہیں ہیں، بلکہ ان کی حیثیت وسائل کی ہے، جو مختلف بزرگوں نے حالات و تجربات کی روشنی میں اختیار کیے ہیں،

پروفیسر ہارون خان شروانی کی اردو خدمات مرتبہ جناب صادق نوید صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت، طباعت اچھی صفحات ۱۹۶، مجلد، قیمت :- صر پتہ: صادق نوید ایم اے، مکان نمبر ۹ ۴ ۴-۸-۲-۱۲، آصف نگر، حیدرآباد نمبر ۲۸،

پروفیسر ہارون خاں شروانی اردو انگریزی کے مصنف اور تاریخ و سیاسیات کے ماہر ہیں
انھوں نے دونوں زبانوں میں مستقل کتابیں اور مضامین لکھے ہیں اور بعض کتابوں کے ترجمے بھی کئے ہیں،
اس کتاب میں اُن کی اردو خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے، یہ دراصل مصنف کا وہ مقالہ ہے جو انھوں نے
ایم اے کے آخری سال کے پرچہ کے لئے شعبۂ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی میں پیش کیا تھا، یہ تین ابواب پر
مشتمل ہے پہلے باب میں شروانی صاحب کے سوانح اور اُن کے خاندان کی مختصر تاریخ اور اس کے بعض نامور
افراد کا اجمالی تذکرہ ہے، دوسرے باب میں اُن کے تراجم و تصانیف اور مضامین پر تبصرہ ہے
اور اُنکی فہرست بھی دیدی گئی ہے، تیسرے باب میں اُن کی اُردو سے دلچسپی، اور اسکی ترقی کے لئے عملی کوششوں
کا مفصل ذکر ہے ایک زمانہ میں وہ آندھرا پردیش قانون ساز کونسل کے رکن بھی تھے، اس حیثیت سے
اُن کو اُردو کی عملی خدمت کا زیادہ موقع ملا، مقالہ نگار نے ان خدمات کا جائزہ لینے کیلئے کونسل
میں اُن کی تقریروں کے مفصل اقتباسات دیئے ہیں، گو یہ کتاب ایم اے کے امتحان کا ایک مقالہ ہے،
اس کے بعض حیثیتوں سے اس میں کچھ خامیاں ہیں تاہم محنت سے لکھی گئی ہے اور نوجوان مرتب حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔

اُردو ہے جس کا نام ...... از جناب ضیاء ہانی صاحب تقطیع خورد، کاغذ اچھا، کتابت و
طباعت معمولی صفحات ۱۰۴، قیمت ۲ روپئے، پتے، (۱) جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی نمبر ۲۵
(۲) ضیاء ہانی تعمیر ادب ۲۳ بندر روڈ، بھیونڈی، مہاراشٹر،

جناب ضیاء ہانی بمبئی کے کوکنی گھرانے کے فرد ہیں، مگر وہ اردو کی خدمت کا جذبہ اور ولولہ رکھتے ہیں انکی
یہ طویل نظم اردو کے ادیبوں اور شاعروں کا انڈکس، اور اردو ادب کی مختصر منظوم تاریخ ہے، سہولت کے
خیال سے ہر بند کے مقابل صفحہ پر ادیبوں اور شاعروں کا مختصر نام بھی تحریر کر دیا گیا ہے لیکن کہیں کہیں تخلص کے
ذکر میں فرق ہو گیا ہے، مگر جیسا کہ خود مصنف نے لکھا ہے یہ نظم نامکمل ہے اسلئے اس میں بہت سے نامور نثر نگار
بھی نظم نہیں ہوئے اور ادیبوں شاعروں اور ناشروں تک ہی محدود رہتا تو اچھا تھا سیاسی اشخاص کا ذکر بے محل ہے،
"ض"

جلد ۱۱۷ ماہ جون ۱۹۷۶ء مطابق ماہ جمادی الثانی ۱۳۹۶ء عدد ۶

مضامین